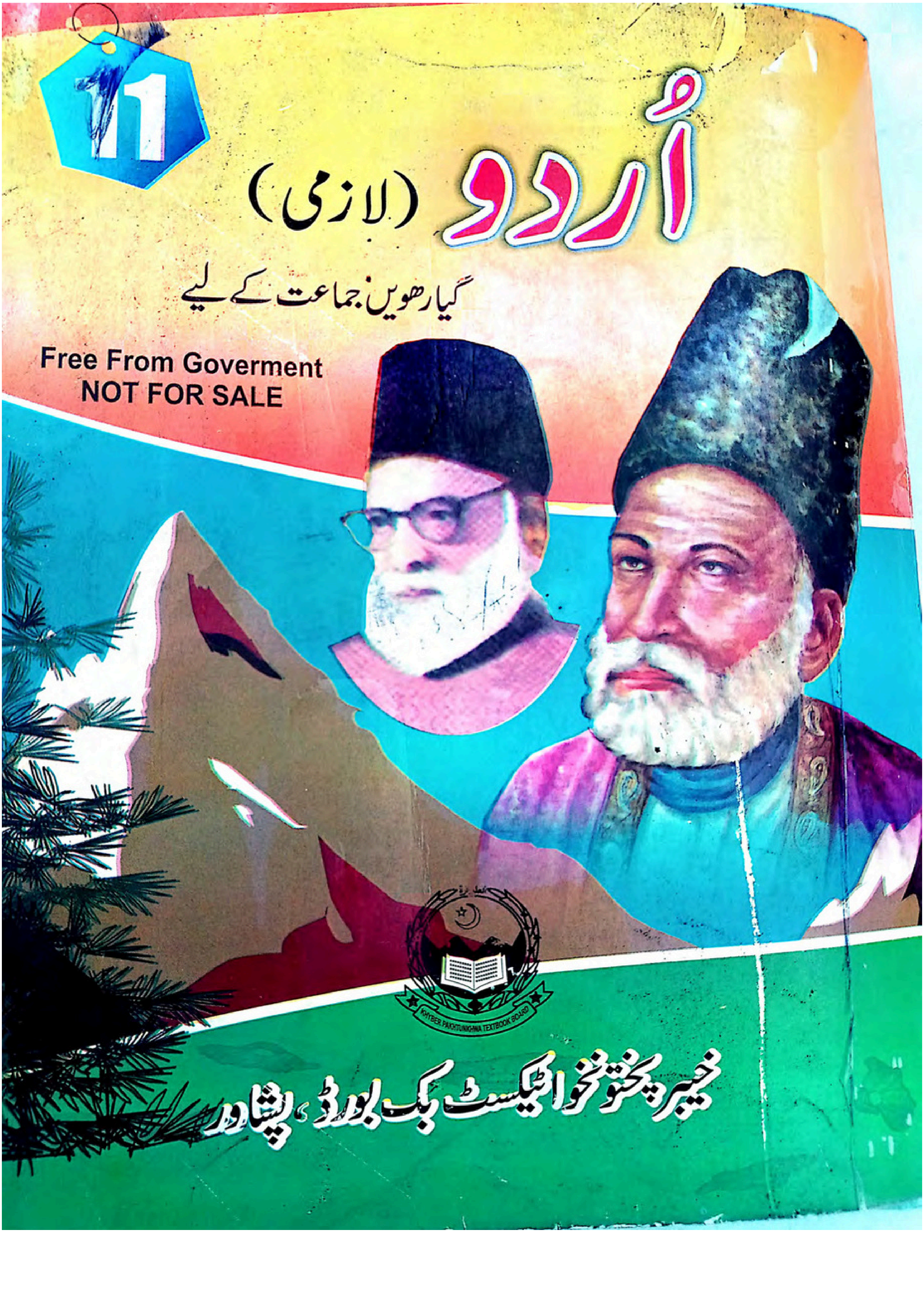
11
اُردو
(لازمی)
گیارھویں جماعت کے لیے
Free From Goverment
NOT FOR SALE
KHYBER PAKHTUNKHWA TEXTBOOK BOARD
خیبر پختونخوا ٹیکسٹ بک بورڈ، پشاور

جملہ حقوق بحق خیبر پختونخوا ٹیکسٹ بک بورڈ پشاور محفوظ ہیں۔

تیار کردہ: خیبر پختونخوا ٹیکسٹ بک بورڈ، پشاور

منظور کردہ: وفاقی وزارتِ تعلیم (شعبہ نصاب)، حکومتِ پاکستان اسلام آباد

مراسلہ نمبر: F.1-12/2009-Urdu مؤرخہ 03-05-2010

مؤلفین:

☆ ڈاکٹر جاوید بادشاہ ☆ پروفیسر خالد صغیر ڈار

☆ پروفیسر محمد جمال ☆ ڈاکٹر اظہار اللہ اظہار

☆ ڈاکٹر طارق ہاشمی

نظرثانی و ترامیم:

☆ سیّدہ طاہرہ جبین، نظامتِ نصاب و تعلیم اساتذہ، ایبٹ آباد

☆ سائرہ بی بی۔ ایس ایس اردو، گورنمنٹ گرلز ہائر سیکنڈری سکول، ملک پورہ

☆ مشتاق احمد، ایسوسی ایٹ پروفیسر، گورنمنٹ ڈگری کالج، خان پور (ہری پور)

☆ شاہین زمان، ایسوسی ایٹ پروفیسر، گورنمنٹ ڈگری کالج سرائے صالح

☆ ابرار خان، لیکچرار اُردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، نوشہرہ۔

☆ ڈاکٹر محمد بلال۔ ایس ایس اُردو، خیبر پختونخوا ٹیکسٹ بک بورڈ پشاور

نگران نظرثانی کمیٹی: سید بشیر حسین شاہ، ڈائریکٹر، نظامتِ نصاب و تعلیم اساتذہ، ایبٹ آباد

مدیر: سلیم اللہ علوی، ماہر مضمون (اُردو) خیبر پختونخوا ٹیکسٹ بک بورڈ، پشاور

طباعت زیرِ نگرانی: رشید خان پائندہ خیل (چیئرمین)

سعید الرحمٰن، (ممبر ای اینڈ پی)

خیبر پختونخوا ٹیکسٹ بک بورڈ پشاور

تعلیمی سال: 2021-22ء

ویب سائٹ: www.kptbb.gov.pk

ای میل: membertbb@yahoo.com

فون نمبر: 091-9217159-60

حاصلاتِ تعلّم

تدریسِ اُردو کے ذریعے طلبہ اس قابل ہو سکیں گے کہ :

☆ اُردو زبان شناسی پر مکمل عبور حاصل کر سکیں۔

☆ اصنافِ سخن کی تعریف کر سکیں اور اُنھیں پہچان کر استحسان کر سکیں۔

☆ مکمل علمِ بیان، علمِ بدیع اور صنعتوں کی تعریف کر سکیں۔

☆ زبان، احساسات، جذبات، خیالات اور تصورات کے حوالے سے کی گئی گفتگو کا مکمل اِدراک کر سکیں۔

☆ اُردو میں اپنا مافی الضّمیر پورے سیاق وسباق کے ساتھ بول چال، گفتگو اور تقریر کے ذریعے سمجھا سکیں۔

☆ عملی زندگی میں سماجی ضرورتوں کے تحت اُردو کو مہارت سے استعمال کر سکیں۔

☆ اُردو نظم ونثر کی صورت میں موجود ادب پارے، صحافت، دفتری وعدالتی ضروریات، جدید علمی اور تکنیکی تحریروں کو پڑھ کر ان کا پورا فہم حاصل کر سکیں۔ ان کا استحسان کر سکیں اور ان پر تنقیدی رائے دے سکیں۔

☆ روز مرّہ زندگی کے مسائل کے حوالے سے غیر رسمی خطوط لکھ سکیں۔ داخلہ فارم، شناختی کارڈ فارم اور دیگر فارم وغیرہ پُر کر سکیں۔

☆ کسی ادبی، علمی، صحافتی موضوع پر اپنے وسیع تر مطالعہ، تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں استدلال، درست تلفّظ اور عمدہ لب ولہجے کے ساتھ کم از کم پانچ منٹ تک تقریر کر سکیں۔

فہرست

حصہ نثر

شمار	عنوان	مصنف	صفحہ
1	اپنی مدد آپ	سرسید احمد خان	1
2	چھوٹے آدمی	مولوی ذکاءاللہ	11
3	نظریۂ پاکستان	ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں	16
4	پاکستانی قومیت کا مسئلہ	ڈاکٹر سید عبداللہ	23
5	کچھ ادب کے بارے میں	ڈاکٹر عبادت بریلوی	30
6	لمحۂ فکریہ	مشتاق صدیقی	37
7	داروغہ جی کی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں	رتن ناتھ سرشار	42
8	آنگن	خدیجہ مستور	54
9	خوب صورت بلا	آغا حشر کاشمیری	63
10	تعلیمِ بالغاں	خواجہ معین الدین	72
11	شیراز اور کنار آب رکنا باد وغیرہ	ابنِ انشا	85
12	روم۔ زندہ شہر، مردہ شہر	جمیل الدین عالی	95
13	لالچی وزیر (ترجمہ)	بشیر احمد بلوچ	101
14	مکاتیب	(ا) مرزا غالب	105
15		(ب) علامہ اقبال	108

حصہ نظم

شمار	عنوان	شاعر	صفحہ
1	حمد	ماہر القادری	115
2	نعت	محسن کاکوروی	118
3	شہر آشوب	نظیر اکبر آبادی	121
4	شہزادے کا چھت پر سونا اور...... (مثنوی)	میر حسن	125
5	دُرِ مراد (مرثیہ)	میر انیس	128
6	تختِ فرس پہ علیؑ اکبر کا خطاب (مرثیہ)	مرزا دبیر	132
7	اُمید (مسدس)	الطاف حسین حالی	135
8	نصیحت اخلاقی	اکبر الہ آبادی	140
9	جلوۂ سحر	حفیظ جالندھری	143
10	پرانا کوٹ	سید محمد جعفری	147
11	یہ سڑکیں	سید ضمیر جعفری	151
12	قطعات	مرزا محمود سرحدی	154
13	اخلاص	عبدالرحمٰن بابا/مترجم طٰہٰ خان	157

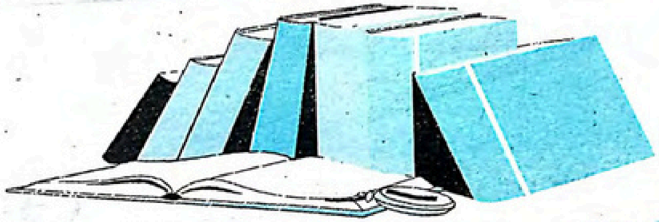

Not For Sale

حصہ غزل

شمار	عنوان	شاعر	صفحہ
1	☆ فقیرانہ آئے صدا کر چلے	میر تقی میر	161
	پیری میں کیا جوانی کے موسم کو رویئے		162
2	☆ قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا	خواجہ میر درد	166
3	☆ ناگہ چمن میں جب وہ گل اندام آگیا	غلام ہمدانی مصحفی	168
4	☆ دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں	مرزا غالب	172
	☆ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے		173
5	☆ آئینہ اپنی نظر سے نہ جدا ہونے دو	داغ دہلوی	176
	فرہنگ		178

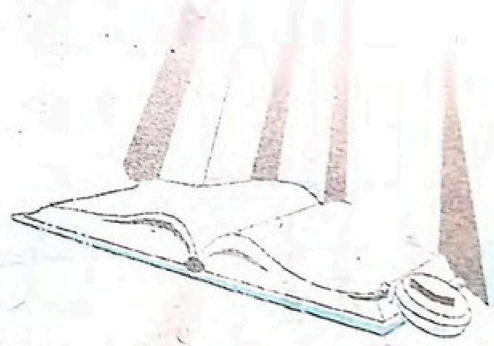

Not For Sale

سر سید احمد خان

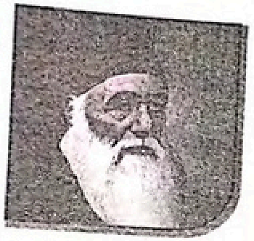

پیدائش: ۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء

وفات: ۱۸۹۸ء

سر سید احمد خان دِلّی میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد سید محمد متقی کو بادشاہ کے دربار میں بڑا اثر و رسوخ حاصل تھا۔ اُس زمانے کے رواج کے مطابق اُنھوں نے قرآنِ مجید، عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ والد اور بڑے بھائی کے انتقال کے بعد اُن کی زندگی پر مذہبی رنگ نمایاں ہوگیا اور انھوں نے فِقہ، حدیث اور قرآنِ مجید کا ازسرِ نو مطالعہ شروع کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے وقت وہ بجنور میں تھے۔ اس جنگ میں مسلمانوں کی تباہی نے اُن کے دِل پر گہرا اثر کیا اور مسلمانوں کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا۔

انھوں نے اندازہ لگایا کہ کسی بھی قوم کی اصلاح اور ترقی تعلیم کے بغیر ممکن نہیں اس لیے انھوں نے اپنی ساری صلاحیتیں مسلمانوں کی تعلیم و تربیت پر صرف کیں۔ علی گڑھ کالج اس کی روشن مثال ہے۔ اس کے علاوہ عام مسلمان گھرانوں کی تربیت اور اصلاح کے لیے ایک رسالہ، ''تہذیب الاخلاق'' بھی جاری کیا۔

سر سید کا ایک اور بڑا کارنامہ سادہ اور آسان نثر کی ترویج تھا۔ اُنھوں نے اُس زمانے کی طرزِ نگارش، جو مقفیٰ اور مسجع نثر کی صورت میں تھی، کو ترک کیا اور مقصدیت کو رواج دیا۔ دراصل وہ ادب برائے ادب کے قائل نہ تھے، بلکہ انھوں نے ادب کو اصلاح کا ذریعہ بنایا۔ اُن کی تحریر میں بڑا تنوّع تھا۔ انھوں نے مذہب، سیاست، تاریخ، ادب، فلسفہ اور منطق، ہر موضوع پر طبع آزمائی کی۔ سر سید کا اُردو ادب پر بڑا احسان ہے کہ وہ زبان جو پہلے فقط حسن و عشق اور تخیلاتی دنیا تک محدود تھی، حقیقت نگاری اور اصلاح کے لیے استعمال ہونے لگی۔

تصانیف: آثار الصنادید، اسبابِ بغاوتِ ہند، خطباتِ احمدیہ، مقالاتِ سر سید وغیرہ

Not For Sale

سرسیّد احمد خان

اپنی مدد آپ

"خدا ان کی مدد کرتا ہے، جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں۔"

یہ ایک نہایت عمدہ اور آزمودہ مقولہ ہے۔ اس چھوٹے سے فقرے میں انسانوں کا اور قوموں کا اور نسلوں کا تجربہ جمع ہے۔ ایک شخص میں اپنی مدد کرنے کا جوش اس کی سچی ترقی کی بنیاد ہے اور جبکہ یہ جوش بہت سے شخصوں میں پایا جاوے، تو وہ قومی ترقی اور قومی طاقت اور قومی مضبوطی کی جڑ ہے جبکہ کسی شخص کے لیے یا کسی گروہ کے لیے کوئی دوسرا کچھ کرتا ہے، تو اس شخص میں سے یا اس گروہ میں سے وہ جوش، اپنی آپ مدد کرنے کا کم ہو جاتا ہے اور ضرورت اپنی آپ مدد کرنے کی، اس کے دل سے مٹتی جاتی ہے اور اسی کے ساتھ غیرت جو ایک نہایت عمدہ قوت، انسان میں ہے اور اسی کے ساتھ عزت جو اصلی چمک دمک انسان کی ہے از خود جاتی رہتی ہے اور جبکہ ایک قوم کی قوم کا یہ حال ہو، تو وہ ساری قوم دوسری قوموں کی آنکھ میں ذلیل اور بے عزت ہو جاتی ہے۔

آدمی جس قدر کہ دوسرے پر بھروسہ کرتے جاتے ہیں خواہ اپنی بھلائی اور ترقی کا بھروسہ گورنمنٹ ہی پر کیوں نہ کریں، یہ امر بدیہی اور لابدی ہے کہ وہ اسی قدر بے مدد اور بے عزت ہوتے جاتے ہیں۔ اے ہم وطن بھائیو! کیا تمھارا یہی حال نہیں ہے؟ ایشیا کی تمام قومیں یہی سمجھتی رہی ہیں کہ اچھا بادشاہ ہی رعایا کی ترقی اور خوشی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یورپ کے لوگ جو ایشیا کے لوگوں سے زیادہ ترقی کر گئے تھے، یہ سمجھتے تھے کہ عمدہ انتظام قوم کی عزت، بھلائی، خوشی اور ترقی کا ذریعہ ہے۔ خواہ وہ انتظام باہمی قوم کے رسم و رواج کا ہو یا گورنمنٹ کا۔ اور یہی سبب ہے کہ یورپ کے لوگ قانون بنانے والی مجلسوں کو بہت بڑا ذریعہ انسان کی ترقی و بہبودی کا خیال کر کے، ان کا درجہ سب سے اعلیٰ اور نہایت بیش بہا سمجھتے تھے۔ مگر حقیقت میں یہ سب خیال غلط ہیں۔

ایک شخص، فرض کرو کہ پارلیمنٹ کا ممبر ہی کیوں نہ ہو جائے قومی عزت اور بھلائی اور ترقی کے لیے کیا کر سکتا ہے؟ برس دو برس میں کسی بات پر ووٹ دے دینے سے گو کیسی ہی ایمانداری اور انصاف سے کیوں نہ دیا ہو،

Not For Sale

قوم کی کیا بھلائی ہو سکتی ہے۔ بلکہ خود اس کے چال چلن پر، اس کے برتاؤ پر بھی اس سے کوئی اثر پیدا نہیں ہوتا تو قوم کے برتاؤ پر کیا اثر پیدا کر سکتا ہے۔ پس یہ بات بے شبہ ہے کہ گورنمنٹ سے انسان کے برتاؤ میں کچھ مدد نہیں ملتی مگر عمدہ گورنمنٹ سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی آزادی سے اپنے قُوائے عمل کی تکمیل اور اپنی شخصی حالت کی ترقی کر سکتا ہے۔ یہ بات روزِ روشن کی طرح ہوتی جاتی ہے کہ گورنمنٹ کا فرض بہ نسبت مثبت اور باعمل ہونے کے زیادہ تر منفی اور مانع ہے اور وہ فرض جان، مال اور آزادی کی حفاظت ہے۔ جب قانون کا عمل در آمد دانشمندی سے ہوتا ہے تو آدمی اپنی جسمی اور ذہنی محنت کے ثمروں کا بے خطر حظ اٹھا سکتا ہے۔ جس قدر گورنمنٹ کی حکومت عمدہ ہوتی ہے اتنا ہی ذاتی نقصان کم ہوتا ہے مگر کوئی قانون گو، وہ کیسا ہی ابھارنے والا کیوں نہ ہو، سُست آدمی کو محنتی، فضول خرچ کو کفایت شعار اور شراب خوار کو تائب نہیں بنا سکتا ہے۔ بلکہ یہ باتیں محنت، کفایت شعاری اور نفس کُشی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ قومی ترقی، قومی عزت، قومی اصلاح، عمدہ عادتوں، چال چلن اور عمدہ برتاؤ کرنے سے ہوتی ہے نہ کہ گورنمنٹ میں بڑے بڑے حقوق اور اعلیٰ درجے حاصل کرنے سے۔

نہایت ٹھیک بات ہے کہ گورنمنٹ عموماً اُن لوگوں کا، جن پر وہ حکومت کرتی ہے، عکس ہوتی ہے جو رنگ اِن کا ہوتا ہے، اسی کا عکس گورنمنٹ میں پایا جاتا ہے۔ جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے تہذیب و شائستگی میں آگے بڑھی ہوئی ہے رعایا اُس کو زبردستی پیچھے سے کھینچ لاتی ہے اور جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے کم تر اور شائستگی میں پیچھے ہوتی ہے وہ ترقی کی دوڑ میں رعایا کے ساتھ آگے کھنچ جاتی ہے۔ یہ ایک نیچر کا قاعدہ ہے کہ جیسا مجموعہ قوم کی چال چلن کا ہوتا ہے، یقیناً اسی کے موافق اس کے قانون اور اسی کے مناسب حال گورنمنٹ ہوتی ہے۔ جس طرح کہ پانی خود اپنی پنسال میں آ جاتا ہے، اسی طرح عمدہ رعایا پر عمدہ حکومت ہوتی ہے اور جاہل و خراب و ناتربیت یافتہ رعایا پر ویسی ہی اکھڑ حکومت کرنی پڑتی ہے۔

تمام تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ کسی ملک کی خوبی و عمدگی اور قدر و منزلت بہ نسبت وہاں کی گورنمنٹ کے عمدہ ہونے کے زیادہ تر اس ملک کی رعایا کے چال چلن، اخلاق و عادات، تہذیب و شائستگی پر منحصر ہے، کیونکہ قوم شخصی حالتوں کا مجموعہ ہے اور ایک قوم کی تہذیب درحقیقت ان مردوں، عورتوں اور بچوں کی شخصی ترقی ہے، جن

سے وہ قوم بنی ہے۔
قومی ترقی مجموعہ ہے: شخصی محنت، شخصی عزت، شخصی ایمانداری، شخصی ہمدردی کا۔ اسی طرح قومی تنزلی مجموعہ ہے: شخصی سستی، شخصی بے عزتی، شخصی بے ایمانی، شخصی خودغرضی اور شخصی برائیوں کا۔ ناتہذیبی اور بدچلنی جو اخلاق وتمدنی یا باہمی معاشرت کی بدیوں میں شمار ہوتی ہے، درحقیقت وہ خود اسی شخص کی آوارہ زندگی کا نتیجہ ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ بیرونی کوشش سے ان برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ ڈالیں اور نیست و نابود کردیں، تو یہ برائیاں کسی اور نئی صورت میں اس سے بھی زیادہ زور وشور سے پیدا ہو جاویں گی۔ جب تک شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کی حالتوں کو ترقی نہ دی جاوے۔

اے میرے عزیز ہم وطنو! اگر یہ رائے صحیح ہے، تو اس کا یہ نتیجہ ہے کہ قوم کی سچی ہمدردی اور سچی خیرخواہی کرو۔ غور کرو کہ تمہاری قوم کی شخصی زندگی کا چال چلن کس طرح پر عمدہ ہو، تاکہ تم بھی ایک معزز قوم ہو۔ کیا جو طریقہ تعلیم وتربیت کا، بات چیت کا، وضع لباس کا، سیر سپاٹے کا، شغل اشغال کا، تمہاری اولاد کے لیے ہے، اس سے ان کے شخصی چال چلن، اخلاق وعادات، نیکی وسچائی میں ترقی ہوسکتی ہے؟ حاشا وکلا۔

جبکہ ہر شخص اور کل قوم خود اپنی اندرونی حالتوں سے آپ اپنی اصلاح کرسکتی ہے، تو اس بات کی اُمید پر بیٹھے رہنا کہ بیرونی زور، انسانوں کی یا قوم کی اصلاح وترقی کرے، کس قدر افسوس، بلکہ نادانی کی بات ہے۔ وہ شخص درحقیقت غلام نہیں ہے، جس کو ایک خدا ناترس نے جو اس کا ظالم آقا کہلایا جاتا ہے، خرید لیا ہے یا ایک ظالم اور خود مختار بادشاہ یا گورنمنٹ کی رعیت ہے بلکہ درحقیقت وہ شخص اصل غلام ہے جو بداخلاقی خودغرضی، جہالت اور شرارت کا مطیع اور اپنی خودغرضی کی غلامی میں مبتلا اور قومی ہمدردی سے بے پرواہ ہے۔ وہ قومیں جو اس طرح دل میں غلام ہیں، وہ بیرونی زوروں سے، یعنی عمدہ گورنمنٹ یا عمدہ قومی انتظام سے آزاد نہیں ہوسکتیں، جب تک کہ غلامی کی یہ دلی حالت دور نہ ہو۔

جب تک انسانوں میں یہ خیال ہے کہ ہماری اصلاح وترقی، گورنمنٹ پر یا قوم کے عمدہ انتظام

پر منحصر ہے، اس وقت تک کوئی مستقل اور برتاؤ میں آنے کے قابل نتیجہ اصلاح وترقی کا قوم میں پیدا نہیں ہوسکتا۔ گو کیسی ہی عمدہ تبدیلیاں گورنمنٹ یا انتظام میں کی جاویں۔ وہ تبدیلیاں فانوسِ خیال سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتیں، جس میں طرح طرح کی تصویریں پھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں مگر جب دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔ مستقل اور مضبوط آزادی، سچی عزت اور اصلی ترقی شخصی چال چلن پر منحصر ہے اور وہی شخصی چال چلن قومی ترقی کا بڑا ضامن ہے۔ جان اسٹیورٹ مل (John Stewart Mill) جو ایک بہت بڑا دانا حکیم گزرا ہے، کا قول ہے کہ " ظالم اور خود مختار حکومت بھی زیادہ خراب نتیجے نہیں پیدا کرسکتی۔ اگر اس کی رعایا میں شخصی اصلاح اور شخصی ترقی موجود ہے اور جو چیز کہ شخصی اصلاح وشخصی ترقی کو دبا دیتی ہے درحقیقت وہی شے اس کے لیے ظالم وخود مختار گورنمنٹ ہے پھر اس شے کو چاہو جس نام سے پکارو۔" اس مقولہ پر میں اس قدر اور زیادہ کرتا ہوں کہ جہاں شخصی اصلاح وشخصی ترقی مٹ گئی ہے یا دب گئی ہے وہاں کیسی ہی آزاد اور عمدہ گورنمنٹ کیوں نہ قائم کی جائے، وہ کچھ بھی عمدہ نتیجے پیدا نہیں کرسکتی۔

انسان کی قومی ترقی کی نسبت ہم لوگوں کے یہ خیال ہیں کہ کوئی خضر ملے، گورنمنٹ فیاض ہو اور ہمارے سب کام کردے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہر چیز ہمارے لیے کی جاوے اور ہم خود نہ کریں۔ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اگر اس کو ہادی اور رہنما بنایا جاوے، تو تمام قوم کی دلی آزادی کو برباد کردے اور آدمیوں کو انسان پرست بنادے۔ حقیقت میں ایسا ہونا قوت کی پرستش ہے اور اس کے نتائج انسان کو ایسا ہی حقیر بنادیتے ہیں، جیسے کہ صرف دولت کی پرستش سے انسان مقیّد وذلیل ہو جاتا ہے۔ کیا لالہ اشرفی مل، جو ہر روز لچھمی کی پوجا کرتے ہیں اور بے انتہا دولت رکھتے ہیں، انسانوں میں کچھ قدر ومنزلت کے لائق گنے جاتے ہیں؟

بڑا سچا مسئلہ اور نہایت مضبوط جس سے زیادہ دنیا کی معزز قوموں نے عزت پائی ہے، وہ اپنی آپ مدد کرنا ہے۔ جس وقت لوگ اس کو اچھی طرح سمجھیں گے اور کام میں لاویں گے تو پھر خضر کو ڈھونڈنا بھول جاویں گے۔ اوروں پر بھروسے اور اپنی مدد آپ یہ دونوں اصول ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہیں۔ پچھلا انسان کی بدیوں کو برباد کرتا ہے اور پہلا خود انسان کو۔

قومی انتظام یا عمدہ قوانین کے اجرا کی خواہش، یہ بھی ایک قدیمی غلط خیال ہے۔ سچا اصول وہ ہے جو ولیم ڈراگن نے ڈبلن کی نمائش گاہ دستکاری میں کہا تھا کہ: ''جس وقت میں آزادی کا لفظ سنتا ہوں، اسی وقت مجھ کو میرا ملک اور میرے شہر کے باشندے یاد آتے ہیں۔ ہم اپنی آزادی کے لیے بہت سی باتیں سنتے آئے ہیں مگر میرے دل میں بہت بڑا مضبوط یقین ہے کہ ہماری محنت، ہماری آزادی، ہمارے اوپر منحصر ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اگر ہم محنت کیے جاویں اور اپنی قوتوں کو ٹھیک طور پر استعمال کریں تو اس سے زیادہ ہم کو کوئی موقع یا آئندہ کی قوی توقع اپنی بہتری کے لیے نہیں ہے۔ استقلال اور محنت کامیابی کا بڑا ذریعہ ہے۔ اگر ہم ایک دلی ولولے اور محنت سے کام کیے جائیں گے تو مجھے پورا یقین ہے کہ تھوڑے زمانے میں ہماری حالت بھی ایک عمدہ قوم کی مانند آرام و خوشی و آزادی کی ہو جاوے گی''۔

انسان کی اگلی پشتوں کے حالات پر خیال کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی موجودہ حالت انسانوں کے نسل در نسل کے کاموں سے حاصل ہوتی ہے۔ محنتی اور مستقل مزاج محنت کرنے والوں، زمین کے جوتنے والوں، کانوں کے کھودنے والوں، نئی نئی باتوں کے ایجاد کرنے والوں، مخفی باتوں کو ڈھونڈ کر نکالنے والوں، آلاتِ جرِثقیل سے کام لینے والوں اور ہر قسم کے پیشہ کرنے والوں، ہنرمندوں، شاعروں، حکیموں، فیلسوفوں، ملکی منتظمین نے انسان کو موجودہ ترقی کی حالت پر پہنچانے میں بڑی مدد دی ہے۔ ایک نسل نے دوسری نسل کی محنت پر عمارت بنائی ہے اور اس کو ایک اعلیٰ درجے پر پہنچایا ہے۔ ان عمدہ کاریگروں سے جو تہذیب و شائستگی کی عمارت کے معمار ہیں، لگاتار ایک دوسرے کے بعد ہونے سے محنت اور علم و ہنر میں جو ایک بے ترتیبی کی حالت میں تھی، ایک ترتیب پیدا ہوئی ہے۔ رفتہ رفتہ نیچر کی گردش نے موجودہ نسل کو اس زرخیز اور بے بہا جائیداد کا وارث کیا ہے، جو ہمارے پُرکھوں کی ہوشیاری اور محنت سے مہیا ہوئی تھی اور وہ جائیداد ہم کو اس لیے نہیں دی گئی ہے کہ ہم صرف مثلِ مارسرِ گنج اس کی حفاظت ہی کیا کریں، بلکہ ہم کو اس لیے دی گئی ہے کہ اس کو ترقی دیں اور ترقی یافتہ حالت میں آئندہ نسلوں کے لیے چھوڑ جاویں۔ مگر افسوس صد ہزار افسوس کہ ہماری قوم نے ان پُرکھوں کی چھوڑی ہوئی جائیداد کو بھی گرا دیا۔

Not For Sale

ایک نہایت عاجز و مسکین غریب آدمی جو اپنے ساتھیوں کو محنت اور پرہیزگاری اور بے لگاوٗ ایمانداری کی نظیر دکھاتا ہے، اس شخص کا اس کے زمانے میں اور آئندہ زمانے میں اس کے ملک، اس کی قوم کی بھلائی پر بہت بڑا اثر پیدا ہوتا ہے، کیونکہ اس کی زندگی کا طریقہ اور چال چلن گو معلوم نہیں ہوتا، مگر اور شخصوں کی زندگی میں خفیہ خفیہ پھیل جاتا ہے اور آئندہ کی نسل کے لیے ایک عمدہ نظیر بن جاتا ہے۔

ہر روز کے تجربہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شخصی چال چلن ہی میں یہ قوت ہے کہ دوسرے کی زندگی، برتاؤ اور چال چلن پر قوی اثر پیدا کرتا ہے اور حقیقت میں یہی ایک عمدہ عملی تعلیم ہے۔ جب ہم اِس عملی تعلیم کا علمی تعلیم سے مقابلہ کریں تو مکتب و مدرسے اور مدرسۃ العلوم (کالج) کی تعلیم اِس عملی تعلیم کی ابتدائی تعلیم معلوم ہوتی ہے۔ زندگی کے علم کا، یعنی زندگی کے برتاؤ کے علم کا، جس کو انگریزی میں "لائف ایجوکیشن" کہتے ہیں، انسان پر، قوم پر بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔ مکتب و مدرسہ و مدرسۃ العلوم کا علم طاق میں، صندوق میں یا الماری میں یا کسی بڑے کتب خانہ میں رکھا ہوا ہوتا ہے مگر زندگی کے برتاؤ کا علم ہر وقت، دوست سے ملنے میں، گھر کے رہنے سہنے میں، شہر کی گلیوں میں، صرافہ کی دُکان میں، ہل جوتنے میں، کپڑا بُننے کے کارخانے میں، کلوں سے کام کرنے کے کارخانے میں اپنے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر بے سکھائے، بے شاگرد بنائے لوگوں میں صرف اِس کے برتاؤ سے پھیلایا جاتا ہے۔

یہ پچھلا علم وہ علم ہے جو انسان کو انسان بناتا ہے۔ اسی علم سے عمل، چال چلن، تعلیمِ نفسی، نفس کشی، شخصی خوبی، قومی مضبوطی اور قومی عزت حاصل ہوتی ہے۔ یہی علم وہ علم ہے کہ جو انسان کو اپنے فرائض ادا کرنے اور دوسروں کے حقوق محفوظ رکھنے اور زندگی کے کاروبار کرنے اور اپنی عاقبت کے سنوارنے کے لائق بنا دیتا ہے۔ اس تعلیم کو آدمی صرف کتابوں سے نہیں سیکھ سکتا اور نہ یہ تعلیم کسی درجے کی علمی تحصیل سے حاصل ہوتی ہے۔

لارڈ بیکن کا نہایت عمدہ قول ہے: "کہ علم سے عمل نہیں آ جاتا۔ علم کو عمل میں لانا، علم سے باہر اور علم سے برتر ہے اور مشاہدہ آدمی کی زندگی کو درست اور اس کے علم کو با عمل، یعنی اس کے برتاؤ میں کر دیتا ہے"۔ علم کی بہ نسبت عمل اور سوانح عمری کی بہ نسبت عمدہ چال چلن، آدمی کو زیادہ تر معزز اور قابلِ ادب بناتا ہے۔

(مقالاتِ سرسید)

Not For Sale

مشق

1- "اپنی مدد آپ" کو مدِنظر رکھتے ہوئے درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات تحریر کریں جو تین سطور سے زیادہ نہ ہوں۔

(۱) وہ کون سا آزمودہ مقولہ ہے جس میں انسانوں اور قوموں کی ترقی کا تجربہ جمع ہے؟

(۲) سرسید کے خیال میں کون سی قوم ذلیل و بے عزت ہو جاتی ہے؟

(۳) نیچر کا قاعدہ کیا ہے؟

(۴) قومی ترقی کن خوبیوں کا مجموعہ ہے؟

(۵) قومی تنزلی کن برائیوں کا مجموعہ ہے؟

(۶) بیرونی کوشش سے برائیوں کو ختم کرنے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے؟

(۷) سرسید کے خیال میں اصلی غلام کون ہے؟

(۸) دنیا کی معزز قوموں نے کس خوبی کی وجہ سے عزت پائی؟

(۹) ولیم براؤن کے اصول کا مفہوم بیان کریں۔

(۱۰) کون سی خوبی آدمی کو معزز اور قابلِ ادب بناتی ہے؟

2- "اپنی مدد آپ" کے متن کو مدِنظر رکھتے ہوئے درج ذیل سوالات کے درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔

(۱) خدا ان کی مدد کرتا ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں، یہ ایک نہایت عمدہ اور آزمودہ:

(ا) کہاوت ہے
(ب) مقولہ ہے
(ج) ضرب المثل ہے
(د) محاورہ ہے

(۲) ایک شخص میں اپنی مدد کرنے کا جوش اس کی سچی:

(ا) تنزلی کی بنیاد ہے
(ب) شہرت کی بنیاد ہے
(ج) عزت کی بنیاد ہے
(د) ترقی کی بنیاد ہے

3- سبق "اپنی مدد آپ" کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے درج ذیل جملے مکمل کریں۔

(ا) خدا ان کی مدد کرتا ہے جو.................. مدد کرتے ہیں۔

(ب) جس طرح پانی خود.................. میں آجاتا ہے۔

(ج) قوم شخصی.................. کا مجموعہ ہے۔

(د) قوم کی سچی.................. کرو۔

(ہ) ہم لوگوں کے یہ خیال ہیں کہ.................. ملے۔

4- سبق "اپنی مدد آپ" کا مرکزی خیال لکھیں جو پانچ جملوں سے زیادہ نہ ہو۔

5- سرسید کے مضمون "اپنی مدد آپ" کا خلاصہ لکھیں۔

6- سیاق و سباق کے حوالے سے درج ذیل اقتباس کی تشریح لکھیں۔

قومی ترقی مجموعہ ہے.................. حالتوں کو ترقی نہ کی جاوے۔

محاورہ اور روزمرہ:-

جب دو یا دو سے زیادہ الفاظ حقیقی معنوں کے بجائے مجازی معنوں میں استعمال ہوں تو وہ محاورہ کہلاتا ہے۔ مثلاً آنکھیں دِکھانا، آنکھوں سے گرانا، آنکھیں بچھانا، نو دو گیارہ ہونا اور تارے گننا وغیرہ۔
روزمرہ اہلِ زبان کے بول چال کا نام ہے۔ روزمرہ میں الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ محاورہ قواعد کی حدود میں آتا ہے جب کہ روزمرہ قواعد سے بالاتر ہوتا ہے۔ اسی طرح محاورے میں تبدیلی نہیں ہوتی جب کہ روزمرہ اہلِ زبان کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔

مولوی ذکاءاللہ

وفات: نومبر ۱۹۱۰ء

پیدائش: ۱۸۳۲ء

مولوی ذکاءاللہ دلّی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام ثناءاللہ تھا۔ بارہ برس کی عمر میں دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ یہاں مولوی محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد کا ساتھ ہوگیا اور ان تینوں میں بڑے تعلقات پیدا ہوگئے۔ مولوی ذکاءاللہ کو ریاضی سے خاص مناسبت تھی۔ ماسٹر رام چندر ریاضی کے استاد تھے اور اپنے اس لائق شاگرد پر خاص عنایت فرماتے تھے۔ ذکاءاللہ اکثر اول آتے، وظیفے حاصل کرتے تھے۔ دو تمغے بھی اپنی اعلیٰ قابلیت کی بنا پر حاصل کیے۔ تعلیم سے فارغ ہوکر اسی کالج میں معلمِ ریاضی مقرر ہوگئے۔ پھر آگرہ کالج میں سات سال تک اردو اور فارسی کے معلم رہے۔ ۱۸۵۵ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوگئے۔ گیارہ سال یہ فرائض انجام دے کر ۱۸۶۶ء میں نارمل اسکول دلّی کے ہیڈ ماسٹر ہوئے۔ تین سال کے بعد اورینٹل کالج کی لکچراری کے لیے پروانۂ تقرر آیا لیکن اتفاق سے اس کے ساتھ ہی میور سنٹرل کالج الٰہ آباد کی پروفیسری بھی انھیں پیش کی گئی۔ انھوں نے الٰہ آباد کو ترجیح دی اور ۱۵ سال اس کالج میں فارسی کے پروفیسر رہ کر ۱۸۸۵ء میں پنشن حاصل کی۔ پھر عمر کے باقی ۲۴ سال خانہ نشین رہ کر تصنیف و تالیف میں گزار دیے۔

ان کی وفات کے بعد ڈپٹی نذیر احمد کا ایک مضمون، ان کے متعلق، رسالہ تمدن دہلی (بابت اگست ۱۹۱۱ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس میں مولوی ذکاءاللہ کے بعض خاص حالات لکھے گئے ہیں۔ اس مضمون کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے:

''بعض مسلمان یہ بھی پوچھ بیٹھتے ہیں کہ مسلم یونیورسٹی کس قسم کے عالم پیدا کرے گی جو پانچ یونیورسٹیاں آج تک پیدا نہ کرسکیں۔ آج کو مولوی ذکاءاللہ زندہ ہوتے، تو میں انھیں کو پیش کردیتا کہ مسلم یونیورسٹی درجۂ تکمیل کو پہنچ کر وَمَاذٰلِکَ علی اللّٰہ بعزیز، ان جیسے عالم پیدا کرے گی: کریم النفس، وسیع الاخلاق، منکسر المزاج، روشن دماغ، متنوّع المعلومات، کثیر التصانیف، خیر خواہِ عامۂ خلق، فیاضِ طبع ۔۔۔ راسخ الاعتقاد، صلحِ کل، مرنجاں مرنج۔''

تصانیف: تاریخ ہندوستان، کرزن نامہ، آئین قیصری، فرہنگِ فرنگ وغیرہ

Not For Sale

جھوٹے آدمی

ایک ضرب المثل مشہور ہے کہ: ''دروغ گورا حافظہ نباشد''، مگر عقل یہ کہتی ہے کہ جب آدمی کا حافظہ اچھا نہ ہو، وہ جھوٹ کا بنج بیوپار نہیں کرسکتا اور دروغ کو فروغ نہیں دے سکتا۔ خواہ اول صورت ہو یا دوسری، دونوں میں جھوٹ اور حافظے میں ایک تعلق ہے۔ حافظہ ایسی قوت ہے جس کو افلاطون نے تمام قوائے عقلیہ کا دیوتا کہا ہے۔ یعنی تمام ملکاتِ نفسانی کا رئیس ہے اور سب اس کے خادم ہیں۔ اہلِ فرانس کو جب کسی کو پرلے درجے کا کودن کہنا ہوتا ہے، تو اس کو کہتے ہیں کہ وہ حافظہ نہیں رکھتا ہے۔ حافظے کے نہ ہونے سے آدمی کو اپنے وعدے یاد نہیں رہتے اور باتیں بھول جاتا ہے۔ ایک ہی کہانی کو بار بار اتنی دفعہ کہتا ہے کہ خواہ وہ کیسی دلچسپ ہو، اُس سے دل پھر جاتا ہے۔ ایک ہی کتاب خواہ کتنی دفعہ پڑھی ہو، وہ اس کو ہر دفعہ نئی کتاب معلوم ہوتی ہے۔ ایک چیز کو خواہ کتنی دفعہ دیکھا ہو، وہ اس کو انوکھی معلوم ہوتی ہے۔

اب سنو کہ ایک جھوٹے تو وہ ہوتے ہیں کہ بات تو جھوٹ کہتے ہیں، مگر وہ اپنے صدقِ دل سے اس کو سچّا جانتے ہیں۔ دوسرے وہ جھوٹے ہیں کہ جھوٹی بات کہتے ہیں اور اس کو خود دل میں جھوٹ جانتے ہیں، اور یہ چاہتے ہیں کہ اور لوگ اس کو سچ جانیں۔ ہم آگے اسی قسم کے جھوٹوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اِن جھوٹوں کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک یہ کہ اپنے دماغ سے ایک جھوٹی بات کو سر سے پاؤں تک تراش کر ایجاد اور اختراع کریں۔ دوسرے یہ کہ ایک سچی حکایت کا بھیس بدل کر اپنے خیال کے موافق بدل بدل کر اس طرح بیان کریں کہ وہ جھوٹ ہوجائے۔ اس صورت میں مشکل ہے کہ ان کا جھوٹ چھپا رہے اور کسی نہ کسی دن ان کا بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔ اس لیے کہ جنھوں نے سچی حکایت کو جھوٹ بنایا ہے، اس کی بنا، راستی پر ہے و جس کا نقشِ اول ان کے حافظے پر جما ہے اور جس کی بنیاد دل میں زیادہ مستحکم اور اُستوار، اُن کے اختراعی جھوٹ سے پڑی ہے۔ قاعدہ ہے کہ سچ کے

Not For Sale

برابر جھوٹ کی بنیاد مستحکم نہیں ہو سکتی، اس لیے ضروری ہے کہ ان کے دروغ میں راستی اپنا فروغ دکھائے اور جس سچ پر جھوٹا ملمع چڑھایا ہے اس کی قلعی کھل جائے اور وہی راستی جو ان کے دل کے اندر دوڑ رہی ہے، ان کے ذہن سے اس اختراعی جھوٹ کو بھلا دے۔

دوسری صورت جس میں ایک جھوٹی بات کو نئے سرے سے گھڑ کر اختراع کرتے ہیں۔ اس کے متضاد کوئی سچی بات ایسی دل پر منقش نہیں ہوتی کہ وہ اس سے جنگِ زرگری کرے۔ پہلی صورت میں تو سچ کو جھوٹا لباس پہنایا تھا، اس کا لباس اُتار کر اصل حقیقت کا دیکھ لینا آسان تھا، مگر دوسری صورت میں جھوٹ کا پُتلا بنایا ہے، یہاں جھوٹ کے پکڑے جانے کا خوف کم ہے، مگر اس کے ساتھ یہ اندیشہ ضرور ہے کہ اگر حافظے میں اس پُتلے کے بنانے کی ترکیب خوب جانشین نہیں ہے، تو وہ ذہن سے نکل جائے گی، پھر قلعی کھل جائے گی۔

تم نے بہت سے آدمی دیکھے ہوں گے کہ وہ جیسا وقت اور موقع دیکھتے ہیں، ویسی باتیں بنا دیتے ہیں، کچھ جھوٹ سچ کا خیال نہیں کرتے۔ ایک ہی معاملے میں ایک شخص سے کچھ کہہ دیتے ہیں، اُس کی جانب مخالف سے کچھ اور فرما دیتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں کوئی بات ایمان اور صداقت کے ساتھ متمکن نہیں ہوتی۔ فقط یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم لوگوں کی مرضی کے موافق باتیں بنا کے ان کا دل خوش کر دیں۔ ایسی باتوں کے کرنے سے وہ اپنا نام صلحِ کُل رکھتے ہیں اور اِس پر فخر کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان کی ساری باتوں کو، جو ایک معاملے میں کرتے ہیں، لکھ لے اور اس کو غور سے دیکھے، تو معلوم ہوگا کہ ان کی باتیں کیسی فریب اور دغا سے بھری ہوئی ہیں، جس کا نام انھوں نے صلحِ کُل رکھا ہے، وہ سراسر نفاق ہے۔ جب ایک آدمی کسی ایک ہی معاملے میں مختلف اوقات میں، مختلف پیرایوں میں اظہارِ رائے کرتا ہے اور اصل حقیقت اس کے دل میں کچھ نہیں ہوتی، تو ان سب کا یاد رکھنا حافظے کی قدرت سے باہر ہو جاتا ہے، اس لیے وہ اپنی کہی ہوئی بات کو بھول جاتا ہے اور اس کی حقیقت کھل جاتی ہے۔ اسی معنی کو کہا کرتے ہیں کہ: ''دروغ گورا حافظہ نباشد''۔

سیدھی سادی سچی باتوں میں جھوٹ بولنے کے برابر کوئی لعنت کی ماری ہوئی بُرائی نہیں ہے۔ ہم انسانوں میں جو باہم رشتہ مندی ہے، وہ فقط نُطق کے سبب سے ہے۔ جب اس نُطق میں کذب شامل ہو، تو انسانوں کے

باہمی تعلقات میں کوئی ایسی بات نہ ہوگی کہ جو فساد سے خالی ہو۔ جن قوموں میں جھوٹ کا رواج ہو گیا ہے، اُن میں کوئی بُرائی باقی نہیں، جو نہ ہو۔ یہ جھوٹ، آگ اور تلوار سے زیادہ ان کا نقصان کر رہا ہے۔

اکثر ماں باپ اپنے بچوں کو ان کی معصوم خطاؤں پر اور بے باک شوخیوں اور گستاخیوں پر خوب گوشمالی کرتے ہیں، مگر وہ یہ یاد رکھیں کہ بچوں کو صرف ان دو قصوروں پر سزا دینی چاہیے؛ ایک جھوٹ پر اور دوسری سرکشی پر۔ جب تک کہ ان دونوں بُرائیوں سے ان کو وہ نہ چھڑائیں، سزا دینے سے ہاتھ کو نہ اُٹھائیں۔ اگر جھوٹ کا چسکا اِس عمر میں زبان کو لگ گیا، تو وہ بڑے ہونے پر اور بڑھے گا۔

بعض بھلے مانسوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ جھوٹ بولنے سننے کی بیماری ان کے پیچھے لگی ہوتی ہے۔ اپنے تشخص وتعلی کی داستانیں نثر میں ایسی ہی گھڑا کرتے ہیں، جیسے کوئی شاعر اشعار میں جھوٹا مضمون گانٹھتا ہے۔ اگر یہ عیب ان میں نہ ہو، تو پھر ان کے بے عیب ہونے میں کچھ شُبہ نہیں رہتا۔

بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے، مگر ہاں! وہاں جہاں اُن کو کچھ فائدہ ہو۔ یہ بات زیادہ تر دکان داروں اور اہلِ پیشہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ سب طرح بھلے مانس ہوتے ہیں، مگر اپنے پیشے میں اپنے فائدے کے لیے جھوٹ بولتے ہیں، مثلاً: دکاندار چیزوں کا بھاؤ جھوٹا بتلاتے ہیں، وکلاء مقدمات جھوٹے لڑتے ہیں۔ ایسے جھوٹ کو نہ وہ خود بولنے والے بُرا جانتے ہیں، نہ اس کو لوگ بُرا سمجھتے ہیں۔

(محاسن الاخلاق)

مشق

۱۔ جھوٹے آدمی کے حافظے کے بارے میں مولانا ذکاءاللہ نے جو ضرب المثل بیان کی ہے۔ اُس کا مفہوم بیان کریں۔

۲۔ کس چیز کے نہ ہونے کی وجہ سے آدمی کو اپنے وعدے یاد نہیں رہتے؟

۳۔ مصنف نے جھوٹوں کی کتنی قسمیں بیان کی ہیں؟

۴۔ انسانوں میں باہمی رشتہ مندی کس سبب سے ہے؟

۵۔ جھوٹ سے سچ کا جاننا کیوں مشکل ہوتا ہے؟

۶۔ درج ذیل الفاظ و تراکیب کو جملوں میں استعمال کریں۔

اختراعی جھوٹ۔ نقشِ اول۔ سچی حکایت۔ اندیشہ۔ جانشین۔ منقش۔ ملکات نفسانی۔

۷۔ جھوٹے لوگوں کی جو خصلتیں مصنف نے بیان کی ہیں۔ انھیں مفصل لکھیے۔

۸۔ ”جھوٹے آدمی“ میں جو مرکبات مستعمل ہیں، اُن کی نشاندہی کریں۔

۹۔ مرکب مصادر کسے کہتے ہیں؟ پانچ مرکب مصدر تلاش کر کے لکھیں۔

اِملا اور تلفظ:

اِملا اور تلفظ میں وہی صورت اختیار کی جائے جو اہل زبان میں رواج پا چکی ہو۔ یعنی اُردو میں بات کرتے ہوئے اُردو ہی کا "لب و لہجہ" اختیار کیا جائے، چاہے وہ عربی زبان کے الفاظ سے متعلق ہو، انگریزی یا کوئی اور زبان۔ تاہم یہ اُصول قرآن مجید اور احادیث مبارکہ پر لاگو نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان

پیدائش: ۲۳/ ستمبر ۱۹۱۲ء

وفات: ۲۵/ ستمبر ۲۰۰۵ء

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان جبل پور میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام گلاب خان تھا، جو نسلاً پٹھانوں کے یوسف زئی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم جبل پور سے حاصل کی، پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ چلے گئے۔ وہاں سے اُنھوں نے فارسی، اردو اور قانون کا امتحان پاس کیا اور امراؤتی کالج ناگ پور میں بطور استاد مقرر ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ کراچی چلے آئے۔ یہاں وہ پہلے اردو کالج اور پھر سندھ یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کو بے شمار سرکاری و غیر سرکاری اعزازات سے نوازا گیا۔ وہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کی یونیورسٹیوں میں پی۔ ایچ۔ ڈی سطح پر لکھے جانے والے کئی مقالات کے ممتحن رہے۔

اردو تحقیق کی روایات کو مستحکم کرنے میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کا اہم کردار ہے۔ اُنھوں نے خود بھی گراں قدر خدمات انجام دیں اور تحقیقی کام کرنے والوں کی سرپرستی بھی کی۔ اُنھوں نے زبان کے ساتھ ادبی اثرات کی دریافت کا فریضہ بھی انجام دیا۔ ڈاکٹر صاحب کا اسلوب سادہ اور سلیس ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں معنی اور مطلب کی پوری وضاحت کر دیتے تھے۔ دینی معلومات ہوں، علمی، ادبی یا تحقیقی، ان کا اندازِ بیان توضیحی اور تشریحی تھا۔ وہ دقیق خیالات کو بڑی آسانی اور روانی سے قلم بند کرتے تھے۔ انکسار اور سادہ بیانی ان کے اسلوب کا حصہ ہے۔ فارسی میں ان کی مہارت مُسلَّم الثبوت ہے۔

تصانیف: علمی نقوش، تاریخ اسلاف، ادبی جائزے، تحقیقی جائزے، تاریخ بہرام شاہ، سرگزشتِ کابل، چند فارسی شعرا، برصغیر میں فارسی ادب، اقبال اور قرآن، معارفِ اقبال، مطالبِ اقبال، مقدماتِ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ہمارا تلفظ، جامع القواعد وغیرہ۔

نظریۂ پاکستان

مسلمانوں نے ہمیشہ رواداری کو اپنا شیوہ بنایا ہے لیکن جب کفر والحاد اپنا غلبہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو مسلمان اس کے مقابلے کے لیے ڈٹ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ بادشاہ اکبر کی بے جا رواداری اور ملکی سیاست میں ہندوؤں کے عمل دخل کی وجہ سے ملک میں کافرانہ طور طریقے اس قدر رائج ہو گئے تھے کہ مسلمانوں کی آزادی خود ان کے دینی معاملات میں بھی ختم ہو گئی تھی۔ چناں چہ اکبر کے آخری دور میں اسلام کی سربلندی کے لیے حضرت مجدد الف ثانیؒ کھڑے ہوئے۔ آپ نے جہانگیر کے زمانے میں محض دین کی خاطر قید و بند کی سختیاں جھیلیں اور اسلامی قدروں کو نئے سرے سے فروغ دیا۔ ان کے اثر سے شاہ جہاں اور اس کے بعد اس کا بیٹا اورنگ زیب، دین کا خادم بنا لیکن اورنگ زیب کے بعد ہی اس کے بیٹوں کے باہمی نفاق اور کمزوری کی وجہ سے مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔ مرہٹوں اور ہندوؤں کے کئی گروہوں نے سر اُٹھایا؛ انگریزوں نے اپنے قدم جمائے اور ملک میں انتشار پھیل گیا لیکن ایسے گئے گزرے حالات میں بھی قوم کو فروغ دینے اور اسلام کو سربلند کرنے کے لیے کوششیں جاری رہیں۔ چناں چہ میسور کے سلطان حیدر علی اور اس کے بیٹے سلطان ٹیپو نے نہ صرف انگریزوں کا مقابلہ کیا بلکہ افغانستان، ترکی اور پھر فرانس کو بھی اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کی لیکن ملک کے ہندوؤں اور دوسرے سرداروں نے ساتھ نہیں دیا اور انھیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

اسی زمانے میں شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے صاحبزادوں نے مسلمانوں کی اخلاقی اور معاشرتی برائیوں کو دور کرنے کی تحریک شروع کی۔ پھر اُن کے پوتے شاہ اسماعیل نے اپنے مرشد سید احمد بریلوی کے ساتھ اسلامی اصولوں کو دوبارہ رائج کرنے اور ملک کو غلامی سے آزاد کرانے کی کوشش میں ۱۸۳۱ء میں اپنی جانیں قربان کر دیں۔ تاہم انھوں نے مسلمانوں کے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی

میں مسلمانوں نے پھر اپنے قدم جمانے کی کوشش کی لیکن انگریزی اقتدار مستحکم ہو چکا تھا، اس لیے اُنھیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس زمانے میں سرسید نے مجبوراً انگریزوں سے مفاہمت کو غنیمت جانا اور مسلمان قوم کی اخلاقی اور تہذیبی اصلاح پر توجہ دی اور ان کے دلوں سے احساسِ کمتری کو دور کرنے کی کوشش بھی کی۔ ۱۸۸۵ء میں ہندوؤں نے کانگریس کی بنیاد ڈالی اور ظاہر یہ کیا کہ وہ ملک کی تمام قوموں کو ان کے حقوق دلوائیں گے لیکن بعد میں پتا چلا کہ وہ صرف اپنے حقوق کا تحفظ چاہتے ہیں۔ اُنھوں نے مسلمانوں کو ان کے کاروبار سے بھی محروم کرنے کی کوشش کی اور وہ سرکاری ملازمتوں پر بھی قابض ہو گئے، نیز انھوں نے مسلمانوں کی مشترکہ زبان اردو کے مقابلے میں ہندی کو قائم کر دیا۔ سرسید نے مسلمانوں کو ہندوؤں کی اس کانگریس اور ان کی سیاست سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی اور ان کے ایک دوست مولانا محمد قاسم نے دیوبند میں مسلمانوں کی دینی تعلیم کی طرف توجہ دی۔ پھر سرسید کے ایک رفیق نواب وقار الملک نے ۱۹۰۶ء میں کل ہند مسلم لیگ کے نام سے مسلمانوں کی ایک الگ تنظیم کی بنیاد ڈالی۔ یہ تنظیم ڈھاکے میں قائم ہوئی تھی، جہاں ہندوؤں نے سازش کر کے مسلمانوں کو زک پہنچانے کے لیے مشرقی بنگال اور آسام کا وہ صوبہ، جس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، ختم کرا دیا اور ۱۹۱۱ء میں اسی علاقے کو پھر بنگال میں شامل کرا دیا۔

اسی زمانے میں پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی، جس میں انگریز کا مقابلہ جرمنی سے ہوا اور ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ ہندوستان کے مسلمان چونکہ ترکی کے سلطان حجاز کی خدمت کرنے کی وجہ سے خلیفۂ اسلام سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے مالی اور طبی امداد بہم پہنچائی جس کی وجہ سے حکومتِ برطانیہ کو مسلمانوں سے عناد پیدا ہو گیا لیکن انھوں نے یہاں کے مسلمانوں سے یہ وعدہ کیا کہ اگر ہمیں اس جنگ میں فتح حاصل ہو گئی، تو ہم کسی طرح بھی ترکی کو مزید نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ یہ وعدہ محض فریب تھا۔ چنانچہ جب انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی، تو وہ اپنے وعدے سے پھر گئے اور انھوں نے ترکی کی وسیع سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ یہاں کے مسلمانوں کو اس فریب کی وجہ سے بہت تکلیف پہنچی اور انھوں نے خلافت کے تحفظ کے لیے مولانا محمد علی جوہر اور ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی کی رہنمائی میں تحریک خلافت شروع کی، لیکن اسی زمانے میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو ہندو بنانے کے

لیے شدھی کی تحریک شروع کی اوران کوختم کرنے کے لیے سنگٹھن کی تحریک بھی شروع کی۔ پھر ۱۹۲۸ء میں کانگریس نے جونہرو رپوٹ شائع کی، اس میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ نمائندگی کا اصول جو وہ بارہ سال پہلے تسلیم کر چکی تھی، بالکل نظر انداز کر دیا۔ پھر تو مسلمانوں میں بڑا جوش پیدا ہوا اور انھیں یقین ہو گیا کہ چونکہ اُن کا دین، ان کی تہذیب اوران کی معاشرت سب کچھ غیر مسلموں سے مختلف ہے، اس لیے کسی حالت میں ہندوؤں سے تعاون نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے الہ آباد والے اجلاس میں علامہ اقبال نے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن (پاکستان) بنانے کی تجویز پیش کی۔ چار سال کے بعد جب قائداعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی صدارت کا مستقل عہدہ قبول کیا، تو انھوں نے اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش شروع کر دی۔ آخر ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو انھوں نے لاہور کے اجلاس میں واضح طور پر اعلان کر دیا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہاں ایک آزاد مسلم ریاست قائم کی جائے۔ اس اعلان کو ''قراردادِ پاکستان'' کہتے ہیں، جس کی رُو سے مسلمانوں کی آزاد اور خود مختار حکومت قائم کرنے کا فیصلہ ہوا۔

یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ دنیا میں قومیت کی تشکیل کی دو بنیادیں ہیں: ایک وہ جو مغربی مفکرین نے قائم کی ہے اور دوسری وہ جو رسول مقبول ﷺ کی قائم کی ہوئی ہے۔ اہلِ مغرب نے خاندانی، نسلی اور قبائلی بنیادوں میں ذرا وسعت پیدا کر کے قومیت کی بنیادیں جغرافیائی حدود پر استوار کیں اور قوم وطن سے بنتی ہے۔ اس نظریے کی وجہ سے دنیا کے انسانوں کے درمیان تباہی کا جو دروازہ کھلا، وہ دو عالمی جنگوں کے ہونے سے بخوبی ظاہر ہے۔ یہ وطنی قومیت ہی کی بنیاد پر لڑی گئی تھیں اور یہ وطنی قومیت جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو تحفظ دینے میں تو بالکل ہی ناکام تھی، کیونکہ جنوبی ایشیا کے مسلمان اس نظریے کے تحت ایک مجبور اقلیت بن جاتے۔

قومیت کی دوسری بنیاد وہ ہے، جو رسول اللہ ﷺ نے ملت اسلامیہ کی تشکیل کرتے وقت قائم فرمائی اور جو مغرب کے تصورِ قومیت سے جدا ہے، جیسا کہ علامہ اقبال نے بھی فرمایا ہے:

> اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
> خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

> ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
> قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

مسلمانوں کی قومیت ایک نظریاتی قومیت ہے، جو لا الٰہ الا اللہ پر قائم ہے، یعنی یہ کہ نسل، رنگ اور وطن کی بنیاد پر نہیں، بلکہ ایک نظریے، ایک عقیدے اور ایک کلمے کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے اور اس نظریاتی پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے، اسے ملت کہا گیا ہے۔ ایسی نظریاتی قومیت میں ہر نسل؛ ہر رنگ اور ہر جغرافیائی خطے کے لوگوں کے لیے جگہ ہوتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو، جن میں ہر نسل، ہر رنگ اور مختلف جغرافیائی خطوں کے لوگ شامل تھے، ایک ایسی قوم کے ماتحت اقلیت بن کر رہنا منظور نہ تھا، جو اسلامی قومیت کے برعکس ذات پات، چھوت چھات اور بت پرستی کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی جداگانہ قومیت، یعنی اسلامی قومیت کی بنیاد پر اپنے لیے ایک جدا وطن کا مطالبہ کیا، جس میں وہ اپنے عقیدے؛ اپنے نظریۂ زندگی؛ اپنے طرزِ معاشرت کے مطابق زندگی بسر کر سکیں اور ایک مسلمان کی حیثیت سے دورِ جدید کے چیلنج کا مقابلہ کر کے اپنے مستقبل کو سنوار سکیں۔

ہمیں اس بات کو بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ نظریۂ پاکستان میں اسلامی زندگی اور قدروں کا تصور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اخوت، مساوات، عدل، دیانت، خداترسی، انسانی ہمدردی اور عظمتِ کردار کے بغیر نظریۂ پاکستان کو فروغ نہیں ہوسکتا۔ نظریۂ پاکستان کا مقصد محض ایک حکومت قائم کرنا نہیں تھا، کیوں کہ مسلمانوں کی حکومتیں ایشیا اور افریقہ میں پہلے سے موجود تھیں۔ نظریۂ پاکستان کا مقصد اسلامی اصولوں کی ترویج واشاعت اور اہلِ عالم کے لیے مثالی مملکت کا نمونہ فراہم کرنا ہے۔

پاکستان قائم کرنے کا فیصلہ ہندوؤں کو بہت ناگوار گزرا۔ انھوں نے پوری کوشش کی کہ یہ مملکت قائم نہ ہونے پائے۔ ان کے پاس دولت اور طاقت تھی۔ جنوبی ایشیا میں ان کی اکثریت تھی، لیکن چوں کہ قیامِ پاکستان کا مطالبہ حق اور انصاف پر مبنی تھا، اس لیے حکومتِ برطانیہ کو مجبور ہونا پڑا اور قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کی پُرخلوص قیادت، مسلمانوں کے یقین، اتحاد اور عملِ پیہم کی وجہ سے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا۔

نظریۂ پاکستان کا مقصد پاکستان کو ایک اسلامی اور فلاحی مملکت بنانا ہے۔ ہمیں ایسا کوئی قدم نہیں اُٹھانا چاہیے، جس کی وجہ سے خدا اور اس کے رسول ﷺ کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ ہمارا جینا اور مرنا پاکستان کے لیے ہونا چاہیے، قومی مفاد کے سامنے ذاتی مفاد کو دل سے نکال دینا چاہیے۔ ہر قسم کی گروہ بندی سے بالاتر ہو کر تمام پاکستانیوں کی فلاح و بہبود کی کوشش کرنا، نظریۂ پاکستان کو فروغ دینا ہے۔ اگر ہم نے نظریۂ پاکستان کو پیشِ نظر رکھا اور اپنی سیرت اور کردار کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی، تو دنیا کی دوسری قوموں میں بھی ہمیں امتیاز حاصل ہوگا اور ہم اسلامی اصولوں کی روشنی میں پاکستان کو توانا، مستحکم، شاندار اور پُرعظمت بنانے میں پوری طرح کامیاب ہوں گے۔ ان شاءاللہ۔

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات تحریر کریں۔

(ا) بادشاہ اکبر کی بے جا رواداری سے کیا نقصان ہوا؟

(ب) مجدد الف ثانیؒ نے اسلام کی کیا خدمت انجام دی؟

(ج) حیدر علی اور سلطان ٹیپو انگریزوں کے خلاف جنگ میں کیوں ناکام ہوئے؟

(د) کانگریس کا قیام کب عمل میں آیا اور اس کے بنیادی مقاصد کیا تھے؟

(ہ) شدھی اور سنگٹھن جیسی انتہا پسند تحریکیں چلانے کا مقصد کیا تھا؟

(و) نظریۂ پاکستان سے کیا مراد ہے؟

(ز) نظریۂ پاکستان کے مقاصد کے حصول کے لیے آپ کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟

۲۔ درست جواب کا انتخاب کریں۔

(ا) مصنف کے خیال کے مطابق: مسلمانوں نے ہمیشہ کس چیز کو اپنا شیوہ بنایا؟

- انسانیت
- رواداری
- صداقت

Not For Sale

(ب) مجدد الف ثانیؒ نے کس کے عہد میں سختیاں جھیلیں؟

- جہانگیر
- اکبر
- اورنگزیب

(ج) شاہ اسماعیل کا شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے رشتہ تھا:

- بھائی کا
- والد کا
- پوتے کا

(د) تحریک خلافت کے رہنما تھے:

- مولانا شوکت علی
- مولانا محمد علی جوہر
- دونوں

(ہ) مسلمانوں کو زبردستی ہندو بنانے کی ناپاک تحریک کا نام تھا:

- آریہ سماج
- سنگٹھن
- شدھی

(و) آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا:

- ۱۹۰۳ میں
- ۱۹۰۵ء میں
- ۱۹۰۶ء میں

(ز) اقبالؒ نے سب سے پہلے خطبہ الہ آباد میں آزاد وطن کا نظریہ پیش کیا:

- ۱۹۰۳ء میں
- ۱۹۳۰ء میں
- ۱۹۳۵ء میں

(ح) نہرو رپورٹ شائع ہوئی:

- ۱۹۲۳ء میں
- ۱۹۲۸ء میں
- ۱۹۲۹ء میں

۳۔ درج ذیل الفاظ و تراکیب کو جملوں میں استعمال کریں۔

کفر و الحاد، رائج، تہذیبی اصلاح، خلیفۂ اسلام، قومیت، مثالی مملکت، انتشار، مستحکم، معرضِ وجود۔

۴۔ اس مضمون سے کم از کم پانچ ایسے جملے تلاش کر کے لکھیں جن میں امدادی فعل کا استعمال ہو۔

۵۔ ''نظریہ پاکستان'' کا خلاصہ تحریر کریں۔

سرگرمی: نظریہ پاکستان اور موجودہ مسائل کے موضوع پر طلبہ کے مابین مکالمہ کرائیں۔

Not For Sale

ڈاکٹر سید عبداللہ

پیدائش: ۵/اپریل ۱۹۰۶ء

وفات: ۱۴/اگست ۱۹۸۶ء

ڈاکٹر سید عبداللہ ضلع مانسہرہ کے گاؤں منگلور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ قرآنِ مجید کے ساتھ اردو کی درسی کتب، حساب، خوش خطی، ابتدائی فارسی اور خطوط نویسی کی تعلیم گھر پر پائی۔ پھر مقامی سکول میں داخلہ لے کر مڈل پاس کیا۔ ۱۹۲۳ء میں میٹرک کا امتحان انھوں نے اسلامیہ ہائی سکول لاہور سے پاس کیا۔ ۱۹۲۴ء میں ایف اے اور ۱۹۲۶ء میں بی اے کرنے کے بعد ۱۹۲۷ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے ایم اے فارسی کیا۔ یہاں انھوں نے پروفیسر حافظ محمود شیرانی، قاضی فضلِ حق اور پروفیسر اسمٰعیل جیسے اساتذہ سے فیض پایا۔ ۱۹۳۲ء میں ایم اے عربی کا امتحان بھی امتیاز سے پاس کیا۔ ۱۹۳۲ء میں ہی جرمن سرٹیفکیٹ اور ۱۹۳۴ء میں لائبریری سرٹیفکیٹ کے امتحان پاس کیے۔ سید عبداللہ پنجاب یونیورسٹی میں عربک اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۳۸ء میں ان کی تقرری اورینٹل کالج لاہور میں استاد کی حیثیت سے ہوئی۔ ۱۹۴۰ء میں وہ شعبۂ اردو میں منتقل ہو گئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۵۲ء میں اسی شعبے میں پروفیسر اور پھر صدرِ شعبہ مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں یونیورسٹی اورینٹل کالج میں پرنسپل کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ انھیں اردو سے بے پناہ لگاؤ تھا اور وہ دن رات، بلکہ آخری سانس تک اردو کے نفاذ کے لیے کوشاں رہے۔ ۹/مارچ ۱۹۸۶ء کو شعبۂ اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں اپنے دفتر میں کام کر رہے تھے کہ ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ کئی ماہ اس مرض میں مبتلا رہنے کے بعد آخر یہ نامور استاد، ادیب، صحافی، عالم اور محسنِ اردو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

تصانیف: نقدِ میر، سرسید اور ان کے رفقا، ولی سے عبدالحق تک، مباحث اور اشاراتِ تنقید وغیرہ۔

پاکستانی قومیت کا مسئلہ

پاکستانی قومیت ابھی تک کچھ بوجھ بجھارت قسم کی چیز ہے جس کی پہیلی بوجھنے اور اس کو سمجھانے کے لیے ہمارے مقرروں اور محرروں کو چودہ برس گزر جانے کے بعد بھی شب و روز مصروف رہنا پڑتا ہے، حالانکہ قومیت کا یہ سوال ۱۹۴۷ء سے پہلے ہی حل ہو چکا تھا اور پاکستانیوں کی الگ قومیت کی دلیل اتنی محکم اور اتنی واضح تھی کہ انگریزوں اور ہندوؤں کی کوئی حجت بازی اس کے سامنے کھڑی نہ رہ سکی تھی اور یہ ماننا ہی پڑا تھا کہ پاکستان کے لیے جدا قومیت کا جو سوال اٹھایا جاتا ہے وہ سو فی صد واضح اور قطعی چیز ہے اور اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ لہٰذا یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ پاکستانی قومیت کی اب پھر تعریف پوچھی جانے لگی ہے، گویا کہ قوم کو ابھی خود بھی معلوم نہیں کہ ہم قوم بھی ہیں یا نہیں اور اگر ہیں، تو پھر ہماری قومیت کا ہمارے پاس ثبوت کیا ہے؟

اگر تحریکِ پاکستان کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے، تو ایک بات اس کی ہر منزل پر صاف صاف اُبھری ہوئی دکھائی دیتی ہے کہ یہ تحریک مسلمانانِ ہندوستان کی متفقہ تحریک تھی، جو اس لیے اٹھائی گئی تھی کہ مسلمانوں کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ مشترکہ ہندوستان میں ان کی روایات، ان کی زبان اور ان کے مخصوص طرزِ زندگی کے زندہ رہنے کے امکانات کم ہوں گے اور انھیں یہ ڈر تھا کہ کسی مشترک نظام میں ان کی ساری تہذیبی ہستی مٹ جائے گی۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ مسلمان اپنی تہذیب اور زندگی کے اس نقطۂ نظر کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے، جس کی بنیاد دینِ اسلام پر قائم تھی۔ گویا مسلمانانِ ہندوستان اپنی ہزار سالہ تہذیبی وراثتوں کو مشترکہ نظام کے خطروں سے بچانے کے لیے مضطرب تھے۔

اس سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ پاکستانی قومیت سب سے پہلے تو ان عقیدوں سے عبارت ہے، جن کا مرکزی نکتہ، اسلام اور اس کا دیا ہوا تصورِ حیات اور نظامِ زندگی ہے، پھر اسی کے پہلو بہ پہلو، ان تہذیبی

Not For Sale

کی گنجائش نہ تھی!
وراثتوں کے تحفظ کا عقیدہ بھی ہے، جن کو ہندوستان کی متحدہ قومیت میں محفوظ کرنے یا ترقی دینے
یہ تو رہے مرکزی عقیدے اب ان کے ہمراہ پاکستانی قومیت کے جغرافیائی تقاضوں اور حدوں کا جائزہ
لینا بھی ضروری ہے، کیونکہ قومیت کی ایک مسلمہ بنیاد کوئی خطہ یا وطن بھی ہے۔ اگر قومیت کے مسئلے کو ایک تشبیہ کی
صورت میں سمجھانا ہو، تو ہم یہ کہیں گے کہ قومیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ جس طرح کسی پھل یا پھول کا
ظاہر بھی ہوتا ہے اور باطن بھی اور وہ پھل یا پھول ان دونوں کے مجموعے سے بنتا ہے، اس قیاس پر پاکستانی قومیت
کی روح یا اس کا باطن تو وہ تخیل ہے، جو اس کی تعمیر کا محرک ہوا، مگر اس کا بدن بھی ہے اور وہ خطہ یا ملک ہے، جس کی
جغرافیائی حدیں مقرر ہیں اور اب اس کا نام پاکستان ہے۔

اس تشبیہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ پاکستان کی روح، یعنی اس کا تخیل تبھی زندہ رہ سکتا ہے، جب روح
کے ساتھ بدن کی بھی حفاظت کی جائے۔ اسی طرح اس کا بدن تب ہی صحیح معنوں میں ایک زندہ ہستی بن سکے گا،
جب اس کے اندر کی روح سالم اور برقرار رہے گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس طرح پاکستانی قومیت کے مرکزی
عقیدے یعنی (اسلامی تخیّل) کو محکم بنانا اور محفوظ رکھنا لازمی ہے، اُس طرح اس تخیل کو اس کے جغرافیائی تخیل سے
وابستہ رکھنا بھی لازمی ہے، اس لحاظ سے پاکستانی قومیت کا دوسرا بڑا عُنصر وطن یا وطنیت ہے۔

اس منزل پر پہنچ کر دو سوال ہمارے سامنے آتے ہیں، جو بعض اوقات بڑے پریشان کُن ثابت ہوتے
ہیں۔ ایک سوال تو یہ ہے کہ جب اسلام میں جیسا کہ اقبال نے کہا ہے: وطن پرستی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا تو
پھر قومیت کے جغرافیائی تخیل کو ہم اسلامی تخیل کے ساتھ ساتھ کس طرح اپنا سکتے ہیں؟ دوسرا شوشہ یہ چھوڑا جاتا ہے
کہ جب پاکستانی قومیت کا مرکزی عقیدہ اسلام ہے اور اس قومیت کے محرک مسلمان ہی ہیں تو اس صورت
میں غیر مسلموں کے لیے پاکستان میں رہنے اور اُس میں ایک وفادار شہری بننے کی مجبوری کیوں؟

میرے خیال میں یہ دونوں سوال جتنے پریشان کُن ہیں، ان سے زیادہ گمراہ کُن ہیں۔ یہ تو معلوم ہے کہ
ہر زندہ قومیت میں جغرافیے کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے، بلکہ یوں کہیے کہ اس میں قومیت کا اولین ظاہری نشان
اس کا جغرافیہ ہی ہوتا ہے، اگرچہ اس کا اصل محرک اس کا اندرونی عقیدہ یا Myth یا تخیل ہی ہوتا ہے مگر کوئی قوم صحیح

اسلام کا مرکزی جغرافیہ جزیرۃ العرب
معنوں میں قوم تب ہی بنتی ہے جب اس کی جغرافیائی حدیں بھی موجود ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ اصل محرک
ہی تھا، پھر جب اسلام باقی ملکوں میں پھیلا، تو اس کی جغرافیائی حدیں بھی وسیع ہوتی گئیں۔ چنانچہ عام مسلمانوں کے تصور میں اب بھی
ہر حالت میں عقیدہ ہی تھا، مگر عقیدہ، جغرافیے کو بھی اپنی لپیٹ میں لیتا گیا۔ مسلمانوں کا کوئی گروہ بے مملکت بھی ہو سکتا ہے، مگر بے
اسلام اور خدا کی زمین کی بادشاہت لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ ان پر قوم یا زندہ قوم کا اطلاق نہیں ہوگا۔ اسلامی
مملکت مسلمان، یا محکوم ہوں گے، یا بکھرے ہوئے افراد ہوں گے، اسلام محض آسمانی یا روحانی مملکت کا قائل نہیں، وہ اپنے
اجتماعیت کا اولین تصور جغرافیائی مملکت سے وابستہ ہے۔
عقیدے کے نفاذ کے لیے ایک ملک کا طالب ہے اور اسی کو عرفِ عام میں وطن کہتے ہیں۔
اسلامیت اور وطنیت میں کوئی تضاد نہیں، بلکہ اسلامیت کی تکمیل وطنیت سے ہوتی ہے۔ وطن اور مملکت
کے بغیر اسلام محض خیالی چیز اور ایک طرح کی رہبانیت بن جاتی ہے۔

علامہ اقبال نے جس وطنیت کی مخالفت کی ہے، وہ یورپ کی وطنیت (Nationalism) ہے جس کی
ایک مخصوص اور طویل تاریخ ہے اور ایک لحاظ سے یہی وطنیت، انسانیت کے لیے بے شمار مصائب کا سرچشمہ رہی
ہے اور اب تک ہے۔ علامہ اقبال اسی کے مخالف تھے اور بجا طور پر مخالف تھے، مگر ان کے افکار میں جغرافیائی
مملکت کی مخالفت کا سراغ کہیں بھی موجود نہیں۔ ان کے نظام فکر میں جس طرح کوئی مملکت نظامِ عقائد کے بغیر،
بربریت اور بدتہذیبی ہے، اسی طرح کوئی نظامِ عقائد، بے مملکت، رہبانیت سے کم نہیں اور یہ چیز اسلام کے عملی تصو
رات کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' اور ''جاوید نامہ'' میں ایشیائی
مملکتوں کو زیادہ قوی بنانے کی تلقین کی ہے۔

معلوم نہیں کس نے بے خیالی میں یہ بے پَر کی اڑا دی تھی کہ اقبال سرے سے وطنیت کے مخالف تھے۔

اقبال، عقائد اور وطن کی وحدت میں گہرا عقیدہ رکھتے تھے اور وہ وطن کے صرف اُس تصور کے مخالف تھے
کہ جس کی بنیاد، مغرب نے چھوٹے چھوٹے نسلی تعصّبات اور مادہ پرستی کی تفریق پر قائم کی تھی اور جس سے نسلی
قومیت اُبھری۔ پھر یہ چھوٹی چھوٹی نسلی اقوام ایک دوسرے سے لڑنے بھڑنے لگیں اور Militarism کی وہ

شکل پیدا ہوئی جس کے باعث دنیا میں دو خوفناک جنگیں ہوئیں اور انسانیت کے لیے بڑے بڑے مصائب کا سرچشمہ ثابت ہوئیں۔

بعض لوگ بددیانتی سے یا سادگی سے، پاکستان میں حُب الوطنی کے پردے میں علاقہ پرستی کی تحریک چلا رہے ہیں، مگر یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ علاقہ پرستی اور وطنیت میں بڑا فرق ہے۔ یوں عام حالات میں کسی شخص کا کسی خاص علاقے سے محبت رکھنا یا اس کے متعلق اچھے جذبات رکھنا بالکل فطری امر ہے مگر اس علاقائی محبت کا وطن کے وسیع مفادات سے ٹکراؤ نہیں ہونا چاہیے ورنہ علاقہ پرستی ایک ایسا مرض ثابت ہوسکتا ہے، جو وطنِ عزیز کی ہستی کے لیے خطرناک ہوگا۔ اس قسم کی علاقہ پرستی کو میں پاکستانی قومیت کا سب سے بڑا دشمن قرار دیتا ہوں جس میں کوئی شخص قومی وحدت کو پارہ پارہ کرنے والی علاقائی وفاداریوں کا اتنا پابند اور عادی ہو جائے کہ خطے پر قوم ہی کو قربان کر دے۔

پاکستان میں بہت سی نسلیں آباد ہیں اور بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان نسلی گروہوں میں بہت سی خوبیاں ہیں اور ان زبانوں کے ادب میں ہمارے لیے بہت سا قابلِ قدر سرمایۂ فکر و تہذیب موجود ہے، مگر ملکی قومیت ہر خطے کے لوگوں سے یہ قربانی مانگتی ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کو خطے کی خدمت کرتے وقت بھی وسیع تر قومی نقطۂ نظر کے تابع رکھیں ورنہ ڈر ہے کہ کسی کمزوری کے وقت یا کسی غیر ملکی سازش یا عقیدے سے متاثر ہوکر یہ خطہ پرستی پاکستان کے شیرازے کو منتشر کر کے اس کی وحدت کو بالکل مٹا ہی نہ دے۔ یہاں بہت سے لوگ مقامی زبانوں کی محبت کا واسطہ دے کر خطے کا تعصب اُبھار رہے ہیں۔ ہم میں سے بہت سے لوگ اس کو ایک معصوم سی تحریک سمجھتے ہیں مگر ہر ذی فہم آدمی کو معلوم ہے کہ پاکستان کے بعض خطوں کی لسانی تحریک دراصل نسلی تحریک ہے اور اس کے پیچھے زبان کی ترقی کا جذبہ اتنا نہیں جتنا علاقائی ریاستوں کا وہ خواب ہے جو ہمارے ملک کے بعض کم فہم بھائیوں کے دل و دماغ میں، ان کی بدبختی کے زیرِ اثر سمایا ہوا ہے۔ لہٰذا میں اپنی دانست میں علاقائی زبانوں کی تحریک کو شُبے کی نظر سے دیکھتا ہوں اور اکثر یہ درخواست کرتا رہتا ہوں کہ حکومت، ملک کی وحدت قومیت کی خاطر اس لسانی تعصب کو پھیلنے سے روکے اور مقامی زبانوں کی ترقی کے ہر منصوبے کے پس پردہ محرکات کا بھی جائزہ لیتی رہے۔

میں پاکستان میں علاقائیت کا اس لیے بھی مخالف ہوں کہ پاکستان کے قیام کے وقت اس علاقائیت کا کوئی سوال نہ تھا۔ پاکستان قبیلوں اور علاقوں کی اساس پر قائم نہیں ہوا ہے، وہ تو اس تاریخی حقیقت پر قائم ہوا ہے کہ مسلمانانِ ہندوستان کو صرف پٹھان، یا پنجابی، یا سندھی، یا بنگالی، یا بلوچ کی حیثیت سے نہیں، بلکہ مجموعی طور پر اپنی تہذیبی وحدت، مشترکہ روایات اور دین و مذہب کو برقرار و محفوظ رکھنا ہے، اسی طرح قیامِ پاکستان کے وقت پنجابی، پشتو، سندھی وغیرہ کے تحفظ کا کوئی سوال نہ تھا، بلکہ سارا سوال یہ تھا کہ مشترکہ ہندوستان میں مسلمانانِ ہند کی تہذیبی زبان کو سخت خطرہ ہے، اس کو بچایا جائے۔

میں پاکستان کی سب اقوام کا مداح و معترف ہوں۔ اسی طرح میں پاکستان کی ہر زبان کی ترقی کا خواہاں ہوں اور ہر زبان کے فروغ کے لیے کوشاں بھی ہوں، مگر یہ سب اس شرط پر کہ ہر علاقے کی خوشحالی مجموعی قومی خوشحالی میں اور ہر خطے کی زبان ملک کی مسلمہ قومی وحدت میں کوئی خلل نہ ڈالے، بلکہ سب اپنے انفرادی رنگوں کے باوجود ملک کی وحدت کو مستحکم کرنے میں پورا پورا اشتراک کریں۔ یہ ان تاریخی حقائق کا تقاضا ہے، جن کے زیرِ اثر ایک الگ ملک کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا تھا۔

اب رہا یہ سوال کہ جب یہ ملک مسلمانوں کا حاصل کردہ ہے اور انھی کے نظریے کی خاطر بنا ہے تو پھر اس میں غیر مسلموں کا کیا مقام ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وطن ہونے کے لحاظ سے پاکستان مسلموں اور غیر مسلموں کا مشترک وطن ہے اور وطن کے اشتراک کا دوسرا مطلب ماسوا اس کے کچھ نہیں کہ اس میں دنیاوی لحاظ سے مسلم اور غیر مسلم شہری کے حقوق مساوی ہوں گے اور مذہب کے فرق سے ان کے حقوقِ شہریت، امن و آسائش اور حقوق و اختیارات میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ اسلام میں یوں بھی عبادت اور مذہبی آزادی کا اصول ایک مُسلّم اصول ہے، لہٰذا غیر مسلموں کو بھی اپنے وطن کی قومیت سے گہری محبت ہوسکتی ہے اور ہونی چاہیے۔

پاکستانی قومیت اور وحدت کے لیے اسلام اور ان تاریخی احساسات کو زندہ رکھنا لازم ہے جن سے یہ ملک ظہور میں آیا۔ خدا نے ہمیں جو جغرافیہ عطا فرمایا اور اس کو یکجا رکھنے کے لیے اسلامی جذبہ بہت قیمتی چیز ہے۔ اس کے علاوہ اردو زبان بھی یک جہتی اور یگانگت کا بہت بڑا وسیلہ ہے۔ (مباحث)

مشق

۱۔ صحیح یا غلط پر نشان لگائیں۔

(ا) پاکستان کے بعض خطوں کی تحریک دراصل نسلی تحریک ہے۔ (ص/غ)

(ب) پاکستانی قومیت بالکل غیر واضح چیز ہے۔ (ص/غ)

(ج) پاکستانی قومیت کی اب پھر تعریف پوچھی جانے لگی ہے۔ (ص/غ)

(د) مسلمان اپنی تہذیب اور زندگی کے نقطۂ نظر کو چھوڑنے کے لیے تیار تھے۔ (ص/غ)

(ہ) اقبال، عقائد اور وطن کی وحدت میں گہرا عقیدہ رکھتے تھے۔ (ص/غ)

۲۔ درج ذیل الفاظ و تراکیب کو جملوں میں استعمال کریں۔

متحدہ قومیت۔ حجت بازی۔ مستحکم۔ نقطۂ نظر۔ شکوک و شبہات۔ تہذیبی وراثت۔ نیک نیتی۔

۳۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے پاکستانی قومیت کا جو مسئلہ بیان کیا ہے، آپ اس سے کس حد تک متفق ہیں؟

۴۔ قومیت اور علاقائیت کے مابین، جو امتیاز مصنف نے واضح کیا ہے، اُسے اپنے لفظوں میں لکھیں۔

۵۔ خالی جگہیں اصل متن کے مطابق پُر کریں۔

(ا) جن کے تصورات کو میں ____ پر محمول نہیں کرتا۔

(ب) پاکستان کے لیے جدا قومیت کا جو ____ اٹھایا جاتا ہے۔

(ج) جس کی کسی نے ____ کرا دی تھی۔

(د) پاکستانی ____ بالکل واضح چیز ہے۔

(ہ) قوم کو ابھی خود بھی معلوم نہیں کہ ہم ____ بھی ہیں یا نہیں۔

۶۔ متعلق فعل کیا ہوتا ہے؟ فعل، فاعل اور مفعول کی مناسبت سے کیسے تبدیل ہوتا ہے؟

ڈاکٹر عبادت بریلوی

پیدائش: ۱۹۲۰ء

وفات: ۱۹۹۸ء

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز اینگلو عربک کالج دلّی سے کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد لاہور آئے اور اورینٹل کالج لاہور سے منسلک ہو گئے اور ترقی کرتے ہوئے شعبۂ اُردو کے صدر بن گئے۔ ڈین فیکلٹی آف آرٹس بھی رہے اور اورینٹل کالج کے پرنسپل بھی۔ ۱۹۸۰ء میں وہ ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔

وہ اردو کے ایک نامور محقق تھے۔ اُن کی بیشتر کتابیں ہندوپاک کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب کا حصہ رہی ہیں لیکن بطور نقاد بھی اُن کی حیثیت مُسلّمہ ہے۔ ان کی تنقید کا انداز وضاحتی تجزیے کا ہے۔ ایسے تجزیے میں کسی مصنف کے ابتدائی احوال سے لے کر ارتقائی مرحلے بھی کچھ زیرِ بحث آجاتے ہیں۔ اُن کا تجزیہ عام طور پر ہمدردانہ ہوتا تھا۔ وہ ادبی مسائل کی پیچیدگیوں میں نہیں الجھتے، بلکہ معنوی سطح پر رہتے ہوئے ادب پارے کا تمام احوال قاری کے سامنے رکھ دیتے تھے۔ وہ اپنے تجزیے کو درجہ بہ درجہ قاری کے سامنے کھولتے ہوئے اسے اپنے منطقی استدلال سے قائل کرتے ہیں۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے ہاں تحقیق اور تنقید کا رشتہ زیادہ مضبوط نظر آتا ہے۔ ایک محقق کی حیثیت سے اُنھوں نے فورٹ ولیم کالج کے اساتذہ کے تصنیفی کارناموں اور غیر معمولی نوادر کو تلاش کیا۔ اُنھوں نے گلکرسٹ کی نظمیں، حیدری کی کہانیاں، ولی، میر اور مومن کے حالات زندگی تلاش کی، جو ایک گرانقدر تخلیقی کارنامہ ہے۔

تصانیف: اُردو تنقید کا ارتقا، تنقیدی زاویے، غزل اور مطالعۂ غزل، غالب کا فن، روایت کی اہمیت، جدید شاعری، جدید اُردو ادب اور میر تقی میر وغیرہ

ڈاکٹر عبادت بریلوی

کچھ ادب کے بارے میں

صدیاں گزر گئیں، جگ بیت گئے لیکن ازل سے ادب کا جو سوتا انسانی ذہن و دماغ، شعور و ادراک اور جذبات و احساسات سے پھوٹا تھا وہ آج بھی اسی طرح بہہ رہا ہے۔ اس درمیان میں ہزارہا انقلاب آئے، زمانے نے بیسیوں کروٹیں لیں اور دنیا کے نقشے کو بدل کر رکھ دیا، لیکن کوئی تبدیلی، کوئی انقلاب، کوئی حادثہ ادب کے اس بہتے ہوئے چشمے کو خشک نہ کر سکا۔ برخلاف اس کے جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا، وقت کے ساتھ ساتھ ادب کے قدم ترقی کی شاہراہوں پر برابر آگے کی طرف بڑھتے گئے۔ زمانے کی مشاطگی اس کو زیادہ سے زیادہ بناتی سنوارتی گئی۔ چنانچہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ حسین بھی ہوتا گیا۔ اس میں زیادہ سے زیادہ دل موہ لینے والی کیفیت بھی پیدا ہوتی گئی۔ زمانے کے تغیرات و انقلابات اس کو ختم تو نہ کر سکے لیکن اُس کے اثرات کو ہر دور کے ادب نے ضرور قبول کیا اور بڑی حد تک وہ ان ہی تبدیلیوں، ان ہی تغیرات اور ان ہی انقلابات کے سانچوں میں ڈھلتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ادب میں ہر زمانے کی تہذیب کے اثرات کارفرما ملتے ہیں وہ بالکل ایک عکس معلوم ہوتا ہے، اس زمانے کے سماجی، معاشی اور اقتصادی حالات کا۔ زندگی کی ساری تصویریں اس میں ہمیں چلتی پھرتی اور جیتی جاگتی نظر آتی ہیں۔

لیکن آخر ادب کیوں پیدا ہوا؟ کیوں اس کا سوتا پھوٹا اور پھوٹ کر چشموں اور دریاؤں کی صورت اختیار کرنے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ، ہر زمانے، ہر دور اور ہر ماحول میں برابر بہتا رہا؟ کیوں اس کو حوادثِ زمانہ کی بادِ سموم خشک نہ کر سکی؟ انقلابات و تغیرات کیوں اس کی راہ میں حائل نہ ہو سکے؟ وہ کیوں ہر زمانے کی زندگی کو سرسبزی و شادابی سے روشناس کرتا رہا اور کیوں اس نے بعض اوقات خود زمانے کی بہتی ہوئی ندی کے دھارے کے رُخ کو بدل دیا؟

یہ سوالات ادب کے ہر اس طالب علم کے لیے ضروری اور اہم ہیں جو ادب کے بارے میں سوچنا سمجھنا اور اس کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کرنا چاہتا ہے۔ ان سوالات کو پوری طرح ذہن نشین کیے بغیر ادب کو پوری طرح سمجھا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ اس کی اہمیت ہی کا نتیجہ ہے کہ ادب کے ساتھ ساتھ ہر دور میں ان سوالات پر بھی ادبیات کے طالب علم غور و خوض کرتے رہے اور انھوں نے اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق مختلف طریقوں اور مختلف زاویوں سے ان پر روشنی ڈالی۔

ہاں! تو ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ادب کیوں اور کس لیے وجود میں آیا؟ ادب کی قدامت کا اندازہ تو صرف اس کی ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ جس وقت انسان اس دنیا میں نیا نیا آیا تھا، اُسی وقت سے اس نے ادب کی تخلیق شروع کر دی تھی۔ تخلیق کا جوہر اور تخلیق کی خواہش انسان کے اندر بالکل فطری ہے، چنانچہ انسان نہ صرف ادب، بلکہ ہر چیز کی تخلیق میں لطف محسوس کرتا ہے۔ کسی ایسی چیز کی تخلیق، جو روزمرہ کے استعمال میں آتی ہو، جس سے انسانیت کو راحت و آرام ملتا ہو، یا پھر کسی ایسی چیز کی تخلیق جس کو صرف دیکھ کر ہی وہ لطف، لذت اور مسرت حاصل کرتا ہو۔ یہ تخلیق کی اس فطری خواہش کا نتیجہ ہے، جو انسان کے اندر قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے۔ بالکل اسی طرح ادب کی تخلیق بھی ہے، جس میں انسان کی اسی فطری خواہش کو دخل ہے۔ البتہ اس کی نوعیت کسی قدر بدل جاتی ہے۔ دوسری تخلیقات کا تعلق مادیت سے ہے، لیکن ادب کی تخلیق میں مادے کو دخل نہیں۔ برخلاف اس کے اس کی نوعیت روحانی ہے۔ انسان کے جذبات و احساسات میں جو موجیں برابر اٹھتی رہتی ہیں، اُن کو خوبصورت الفاظ کا جامہ پہنا دینا ادب کہلاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان جذبات کا پُتلا ہے اور ابتدائے آفرینش میں تو وہ سوائے جذبات کے اور کچھ تھا ہی نہیں۔ اُن دنوں اُس میں عقل و شعور کے عناصر پوری طرح بیدار نہیں ہوئے تھے۔ وہ چیزوں کے متعلق سوچ سمجھ کم سکتا تھا۔ خارجی چیزیں اور ان سے پیدا ہونے والے ذرا ذرا سے واقعات اُس کے جذبات کے ٹھہرے ہوئے سمندر میں ایک ایسی ہوا کا کام کرتے تھے، جس سے اس میں مدّ و جزر اور تلاطم کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ جذبات کے سمندر کی ان متلاطم موجوں کو وہ الفاظ کا روپ دے دیتا تھا، جس کو آج ہم ادب کے تحت شمار کرنے کے لیے مجبور ہیں۔ دنیا میں نو وارد انسان کو اگرچہ لکھنے پڑھنے کا شعور نہیں تھا، لیکن

اس کے باوجود جہاں تک ادب کا تعلق ہے، اُس کی تخلیقی کوششیں جاری تھیں۔ چنانچہ ابتدائی زمانے میں ادب کے نشانات ہمیں اُن گیتوں کی شکل میں ملتے ہیں جو انسان کے وقتی تاثر کے زیرِ اثر تخلیق کیے گئے تھے اور جن کو لوگوں نے زبانی یاد کر لیا تھا اور جب لکھنے کا شعور پیدا ہو گیا تھا تو ان کو پہلے پتوں پر اور پھر کاغذ اور کپڑے وغیرہ پر لکھ کر محفوظ کر لیا تھا۔ یہ ادب کے ابتدائی نقوش تھے جو وقت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ بنتے سنورتے رہے اور جن کے موضوعات میں اضافہ ہوتا رہا۔

سوال یہاں یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ ان جذبات واحساسات کو انسان نے خود اپنے تک محدود کیوں نہیں رکھا اور عالم آشکارا کر دینے کی کوشش کیوں کی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان میں یہ خواہش بھی بالکل فطری ہے کہ جو خیالات اس کے دل میں پیدا ہوں، ان کو وہ بہتر سے بہتر طریقے سے دوسروں تک پہنچائے۔ انسان ایک سماجی مخلوق ہے۔ ایک دوسرے سے مل جل کر رہتا ہے اور اس پر جو کچھ گزرتی ہے، جو سانحات بھی اس کے دل پر اپنے نقوش چھوڑتے ہیں، حالات کی جن کروٹوں سے بھی وہ متاثر ہوتا ہے، اُن سب کو کسی نہ کسی صورت میں ساتھیوں تک پہنچا دینا، اس کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ جو کچھ بھی لکھتا ہے؛ جس چیز کی بھی تخلیق کرتا ہے، اس میں پہلے تو اُس کو ذاتی طور پر سکون ملتا ہے اور دوسری طرف سماج کے دوسرے افراد اس میں دلچسپی لیتے ہیں، اگر انسان کے دل میں یہ خواہشات نہ ہوتیں، تو ادب اپنی موجودہ صورت میں ہمیں ہرگز نظر نہ آتا۔

ایک طرف تو تخلیق کی فطری خواہش اور دوسری طرف اپنے آس پاس کے افراد سے دل پر بیتی ہوئی حالت کو ظاہر کر دینے کا خیال، ان دونوں عناصر نے مل کر ادب کو پیدا کیا۔ اسی لیے ادب بہ یک وقت انسان کا ایک اضطراری اور سماجی فعل ہوا جس میں آفاقیت کی جھلکیاں بسیرا لیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ بعض جگہ اس نے اپنے مخصوص ماحول اور سماج کی عکاسی ضرور کی، لیکن بڑا ادب وہی سمجھا گیا جس میں آفاقیت کے عناصر کی پوری طرح کارفرمائی تھی۔ غرض ادب پھیلا اور بڑھا اور چونکہ وہ انسانوں کی اپنی چیز تھی، اس لیے انھوں نے اس سے دلچسپی لی۔ یہ اور بات ہے کہ مختلف لوگوں کے ادبی مذاق میں اختلافات رہے، لیکن ادبی ذوق ان میں رہا ضرور! یہ بات کسی قدر عجیب ضرور ہے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں سماج کے افراد انفرادی اور اجتماعی طور پر ادب سے دلچسپی لیتے

Not For Sale

رہے۔ ادبی ذوق اچھا یا بُرا، کم یا زیادہ ہر شخص کے دل میں رہا ضرور۔ بعضوں نے اپنے علم، شعور اور مذاق کی بلندی اور شستگی کے باعث اس میں نکھار پیدا کیا اور بعضے ان باتوں کے فقدان کے باعث ایسا نہ کر سکے لیکن ذرا گہری نظر ڈالنے کے بعد یہ بات حقیقت نظر آنے لگتی ہے کیونکہ جس طرح انسانوں کے اندر ادب کو تخلیق کرنے کی خواہش بالکل فطری ہے، اسی طرح اس سے دلچسپی لینا بھی ان کی فطرت میں داخل ہے۔ کون انسان ایسا ہو سکتا ہے جو دوسرے انسانوں کے جذبات واحساسات سے دلچسپی نہ لیتا ہو اور پھر جب اس جگ بیتی کے روپ میں اس کو آپ بیتی کی تصویریں نظر آئیں اور پھر جب ان کا پیش کرنے والا فن کار ان میں ایسے رنگ بھر دے، جو ان کو فن کاری کے زیور سے آراستہ و پیراستہ کر کے تمام تر جمالیاتی خوبیوں کا نمونہ بنا دیں۔

انسان کے اندر حُسن کا احساس سب سے زیادہ قوی ہے اور وہ ہر لحہ اور ہر گھڑی اس حُسن کی تلاش میں رہتا ہے اور ادب چونکہ فنکاری کے ساتھ ساتھ چند خاص خیالات اور چند خاص جذبات واحساسات کو پیش کرنے کا نام ہے، اس لیے اس میں حسن کا پیدا ہونا لازمی ہے اور جب کسی چیز میں حسن پیدا ہو جاتا ہے تو انسان اس میں دلچسپی لیے بغیر نہیں رہ سکتا، کیونکہ وہ فطرتاً حسن کا شیدائی ہے۔ چنانچہ ادب سے انسان کی دلچسپی کی ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں فن کارانہ اور صناعانہ حسن کی دنیائیں سموئی ہوئی ہوتی ہیں۔ وہ اس سے دلچسپی لیتا ہے، کیونکہ اس کے وجود سے اس کے احساسِ جمال کو تسکین ہوتی ہے۔ یہ احساسِ جمال کوئی اٹل چیز نہیں، یہ بھی وقت، ماحول، حالات وواقعات، افتادِ طبع اور ذہنی رجحانات کے اختلافات کے باعث ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے، لیکن احساسِ جمال کا ہونا ہر انسان کے اندر لازمی ہے۔ خواہ وہ کم ہو یا زیادہ، اچھا ہو یا بُرا۔ یہ ممکن ہے کہ ادب یا فنونِ لطیفہ کا ایک شاہکار ایک ہی وقت میں ایک ایسے انسان کی دلچسپی کا باعث بنے اور اس کے احساسِ جمال کو تسکین دے، جس کے مزاج، افتادِ طبع اور ذہنی رجحان میں اس شاہکار کی خصوصیات میں ہم آہنگی ہو اور اس وقت وہی شاہکار ایک دوسرے انسان کی، جس کے مزاج کو اس سے مناسبت نہیں، طبیعت منغض کر دے، لیکن یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ کوئی بھی انسان کسی بھی خوبصورت چیز کو دیکھ کر متاثر نہ ہو۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے، اس میں تو حسن ہوتا ہی ہے، چاہے اس کے موضوعات بہ ذاتِ خود حسین نہ ہوں، بلکہ کریہہ اور بدصورت ہوں۔

Not For Sale

یہ تو فن کار کا کمال ہے کہ وہ بدصورت سے بدصورت چیز میں بھی حُسن کی رعنائی اور دل کشی پیدا کر دے۔ بہر حال ادب ایک ایسا مقام ہے، جہاں فنکار کی صناعی بدصورت چیز کو بھی حسن کے زیور سے آراستہ و پیراستہ کر کے پیش کر سکتی ہے۔ اس اعتبار سے ادب کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا ہے کیونکہ ہماری سماجی زندگی میں کوئی اور مقام ایسا نہیں آسکتا، جہاں بدصورت چیز کو بھی حسین بنا کر پیش کیا جا سکے۔ یہ شرف صرف فنونِ لطیفہ اور ادب کو ہی حاصل ہے۔ پس انسانی زندگی میں اس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

(تنقیدی زاویے)

مشق

۱۔ متن کی مدد سے خالی جگہ پُر کریں۔

(ا) انسان کے اندر حُسن کا احساس سب سے زیادہ قوی ہے۔

(ب) زمانے کی مشاطگی اس کو زیادہ سے زیادہ بناتی سنوارتی ہے۔

(ج) ان جذبات و احساسات کو .... نے خود اپنے تک محدود کیوں نہیں رکھا۔

(د) ادب سے انسان کی .... کی ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی ہے۔

(ہ) بہر حال یہ .... کے ابتدائی نقش تھے۔

(و) ادب کے قدم ترقی کی .... پر برابر آگے بڑھتے گئے۔

(ز) احساسِ جمال کا ہونا ہر .... کے اندر لازمی ہے۔

۲۔ عبادت بریلوی نے اس مضمون میں کن زاویوں سے ادب کی افادیت پر روشنی ڈالی ہے؟

۳۔ تنقیدی تعریف کریں نیز بتائیے کہ زیرِ نظر مضمون "کچھ ادب کے بارے میں" کہاں تک اس پر پورا اُترتا ہے؟

۴۔ ادب کی اہمیت پر نوٹ لکھیں۔

۵۔ فعل کی فاعل سے مطابقت کے حوالے سے جملے درست کر کے لکھیں۔

☆ میری کتابیں، قلم اور کاپیاں سب چوری ہو گئے۔

☆ چار کپ، ایک گلاس اور دو پلیٹیں ٹوٹ گئے۔

☆ شاہ جہاں نے عمارتیں بنوائیں۔

☆ ہم نے پہاڑ کے پتھروں کو کالے پائے۔

☆ فضول خرچی کی وجہ سے اس کا سرمایہ اور احترام لُٹ گئے۔

۶۔ سیاق و سباق کے حوالے سے درج ذیل جملوں کی تشریح کریں۔

ا۔ ایک طرف تو تخلیق کی فطری خواہش اور دوسری طرف اپنے آس پاس کے افراد سے دل پر بیتی ہوئی حالت کو ظاہر کر دینے کا خیال، ان دونوں عناصر نے مل کر ادب کو پیدا کیا۔

ب۔ اس اعتبار سے ادب کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا ہے، کیوں کہ ہماری سماجی زندگی میں کوئی اور مقام ایسا نہیں آسکتا، جہاں بدصورت چیز کو بھی حسین بنا کر پیش کیا جا سکے۔

اُردو حُروفِ تہجی:

ا، آ، ب، پ، ت، ٹ، ث، ج، چ، ح، خ، د، ڈ، ذ، ر، ڑ، ز، ژ، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ع، غ،
ف، ق، ک، گ، ل، م، ن، و، ہ، ی، ے۔ (تعداد = ۳۷)

مُرکب حُروف: وہ حروف ہیں جو ہائے دوچشمی (مخلوط) سے مل کر بنتے ہیں۔ یہ کل تعداد میں پندرہ (۱۵) ہیں۔

بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، رھ، ڑھ، کھ، گھ، لھ، مھ، نھ

زبان کے جدید اُصولوں کے مطابق الف پہلے اور آ بعد میں آتا ہے کیونکہ الف ایک جب کہ الف + الف = آ شمار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ہائے مخلوط (ھ) اُردو میں کبھی لفظ کے شروع میں نہیں آتا۔ ہمزہ اُردو میں پورا حرف شمار نہیں ہوتا یہ بسا اوقات بطورِ اضافت آتا ہے۔ مثلاً سرمایۂ اُردو، مجموعۂ کلام، تحفۂ خلوص۔

ہدایات برائے اساتذہ:	طلبہ کو تنقید کی تعریف اور چند مشہور نقادوں کے نام بتائیں۔

مشتاق احمد صدیقی

پیدائش: ۲/اگست ۱۹۶۰ء

صوبہ خیبر پختونخوا کے مَردم خیز شہر ایبٹ آباد میں پیدا ہوئے۔ پشاور یونیورسٹی سے ایم۔اے (اُردو) کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور دوسری پوزیشن حاصل کی۔ 1987ء سے صوبے کے مختلف کالجوں میں درس وتدریس میں مصروف رہے اور آج کل گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج نمبر 1 ایبٹ آباد میں بحیثیت صدر شعبہء اُردو اپنے فرائض منصبی ادا کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے ایم۔فل اُردو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے مقالہ مرزا عزیز احمد دارا پوری، احوال و آثار، لکھ کر مکمل کیا جب کہ اسی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کے ریسرچ سکالر رہے اور ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا عنوان ''ممتاز شیریں کا ذہنی ارتقا'' ہے۔

ان کا طبعی رجحان تحقیق اور تنقید نگاری کی طرف رہا۔ ان کی نگارشات مختلف ادبی رسائل و جرائد اور کالج میگزینز میں چھپتے رہے، ان کے اہم مطبوعہ مضامین درج ذیل ہیں۔

۱۔ پیروڈی اور اُردو ادب
۲۔ تحقیق وتنقید کا رشتہ
۳۔ بنیاں انگارے ایک جائزہ
۴۔ تصورِ خدا اور مفہوم دُعا
۵۔ صحرائیت وبدویت اقبالؒ کی نظر میں
۶۔ ایہام گوئی کی تحریک کے اسباب

لمحۂ فکریہ

وطنِ عزیز اسلامی جمہوریہ پاکستان ایک ترقی پزیر ملک ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے قدرتی وسائل سے مالا مال کیا ہے لیکن روز بڑھتی ہوئی آلودگی اور آبادی نے اس کی ترقی میں رکاوٹیں ڈالی ہیں۔ کسی بھی ملک یا معاشرے میں آبادی اور وسائل کے درمیان، ''خصوصاً خوراک کے وسائل'' اس دباؤ کا باعث بن جاتے ہیں جس کے نتیجے میں عموماً معیارِ زندگی میں کمی واقع ہوتی ہے۔ اس کمی اور دباؤ کو دور کرنے کے لیے بالآخر انگلستان کے مشہور معیشت دان تھامس مالتھس (Thomas Malthus) نے نظریۂ آبادی پیش کیا جس کا تعلق آبادی میں کمی سے ہے۔

حالیہ دہائیوں کے دوران میں کئی ترقی پذیر ممالک ''جن میں بھارت، سری لنکا، بنگلہ دیش اور پاکستان شامل ہیں'' افراطِ آبادی کا شکار ہیں۔ ان ممالک میں ہر سال آبادی کے دباؤ میں جو اضافہ ہو رہا ہے وہ ساری دنیا کے پچاس چھوٹے ممالک کی کل آبادی سے بھی زیادہ ہے جس کی وجہ سے ان ممالک کی ترقی کی رفتار متاثر ہو رہی ہے۔ ان کی پیداوار، فی کس آمدنی، سرمایہ کاری اور بچتیں بھی متاثر ہوتی جا رہی ہیں۔ جس سے عوام روز افزوں مہنگائی کے مصائب میں گرفتار ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

آبادی کے دباؤ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ ممالک جہاں آبادی کا دباؤ کم ہے اور دوسری ان ممالک کی جہاں آبادی کا دباؤ بہت زیادہ ہے۔ آبادی کے دباؤ کی یہ اقسام ہر ملک کی شرح پیدائش کو مدنظر رکھ کر متعین کی جاتی ہیں۔ جن مالک میں آبادی کا یہ دباؤ کم ہے وہاں عموماً شادیاں زیادہ عمر میں کی جاتی ہیں جس کی وجہ سے آبادی کے دباؤ میں اضافہ نہیں ہوتا لیکن جن ممالک میں شادیاں کم عمری میں کر دی جاتی ہیں وہاں آبادی کے دباؤ میں بے تحاشا اضافہ ہو جاتا ہے۔

اس وقت وطنِ عزیز کو بھی یہی مسئلہ درپیش ہے اور اس کی آبادی میں 1.73 فیصد سالانہ شرح سے اضافہ ہوتا جا رہا ہے جو کسی بھی ہمسایہ ملک سے بہت زیادہ ہے۔ اگر اس میں کمی نہ کی گئی تو آئندہ 37 سالوں میں آبادی دوگنا ہو جائے گی اور یہ 2050ء تک 349 ملین تک پہنچ جائے گی۔ جبکہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی اوسط شرح آبادی 0.1

فیصد ہے۔ وطنِ عزیز کی آبادی کا اس طرح بڑھنا اور اس کے دباؤ میں اضافہ ہونا ایک ایسا لمحۂ فکریہ ہے کہ جس سے آگاہی ہر ذمہ دار شہری کا فرض ہے۔ اس دباؤ کی کمی میں ملکی اور انفرادی سطح پر کوششیں وقت کی اہم ضرورت ہے۔

تخلیقِ آدم کے بعد نسل انسانی تیزی سے پھیلنی شروع ہوئی اور سیکڑوں سے لاکھوں، لاکھوں سے کروڑوں اور کروڑوں سے اربوں تک جا پہنچی ہے۔ آغاز میں اس میں اضافے کی رفتار کم تھی لیکن گزشتہ دو، تین صدیوں کے دوران میں اس میں بہت تیزی سے اضافہ ہوا۔ اس طرح ضروریاتِ زندگی میں بھی اضافہ ہوا اور رہائش و خوراک کے مسائل نے جنم لیا۔ لامحالہ قدرتی وسائل پر بھی بوجھ بڑھ گیا۔ درختوں کے بے تحاشا کٹاؤ سے جنگل سکڑ گئے۔ قصبوں اور شہروں پر بڑھتی ہوئی آبادی کے دباؤ سے زرخیز زرعی زمینوں پر مکانات، کارخانے اور فیکٹریاں بن گئیں۔ اس طرح زرعی زمین کی کمی نے وطنِ عزیز کو مزید وسائل کی کمی کا شکار بنا دیا ہے۔

شہری آبادیوں کا استعمال شدہ گندہ پانی، کارخانوں، فیکٹریوں اور گاڑیوں کے دھوئیں اور ہر طرف پھیل جانے والی گندگی کی بہتات و کثرت نے آبی، فضائی اور زمینی آلودگی میں اضافہ کیا ہے۔ اس طرح وطنِ عزیز میں جہاں ہر طرف آلودگی نے ڈیرے ڈالے وہاں بڑھتی ہوئی آبادی کا بوجھ بھی ہمارے قدرتی وسائل برداشت نہ کر سکے اور ہمیں وسائل کی قلت کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی بنا پر پوری دنیا میں بڑھتی ہوئی آلودگی اور آبادی کے پیشِ نظر پوری دنیا کے ماہرینِ معاشیات، منصوبہ ساز اور ماحول کا تحفظ چاہنے والے فکر مند ہیں اور وہ سب وسائل اور ضروریات میں توازن قائم کرنے پر زور دیتے ہیں تاکہ پوری نوعِ انسانی کے معیارِ زندگی کو بہتر کیا جا سکے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم اپنی بڑھتی ہوئی آلودگی اور آبادی کے بارے میں فکر مند ہوں گے۔

وطنِ عزیز بھی اسی طرح کے پیچیدہ حالات سے دوچار ہے جس کے باعث ترقی کی رفتار سست سے سست تر ہوتی جا رہی ہے جس سے عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے میں مشکلات درپیش ہیں۔ کسی بھی ملک کے عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے لیے خوراک، رہائش، تعلیم، طبی سہولتوں اور دیگر اشیا کا مناسب مقدار میں میسر ہونا ضروری ہوتا ہے۔ قومی نقطۂ نظر سے بہتر زندگی کے لیے قوم کے ہر فرد کو اس کی ضروریات اور سہولیات کا میسر ہونا ناگزیر ہے۔ جتنے کم افراد کو یہ سہولیات میسر ہوں گی اس قوم کا معیارِ زندگی اتنا ہی کم ہو گا۔ جس کا ایک بڑا سبب سرکاری اور نجی سطح پر منصوبہ بندی کا فقدان

ہے۔ اگر زندگی کے ہر شعبے میں سرکاری اور نجی سطح پر منصوبہ بندی سے کام لیا جائے تو اِن درپیش مسائل میں خاطر خواہ کمی کی جا سکتی ہے، عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کیا جا سکتا ہے اور وطنِ عزیز کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا جا سکتا ہے۔

جُوئے خُوں ہے لہر میں، پر کوئی شیریں نہیں
ہر کوئی فرہاد ہے، مفلسی کے دہر میں

معیارِ زندگی کا تعلق مادی اشیا اور سہولیات کے حصول کے ساتھ ساتھ اس کے سماجی ماحول اور ذہنی کیفیت سے بھی ہے۔ مثلاً تعلیم اور اس کی شرح خواندگی، صحت اور حفظانِ صحت کے اصولوں پر عمل، جمہوری اقدار، آزادیٔ اظہار، سماج میں خواتین کا مقام، ترقی کے یکساں مواقع، قانون کی پاسداری اور کتب بینی کی شرح، معیارِ زندگی کو بہتر بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

بہتر معیارِ زندگی ہر فرد کا بنیادی حق ہے لیکن آبادی اور وسائل میں عدم توازن اس حق کو متاثر کرتا ہے۔ اس سے محبت، احترام، دردمندی اور رواداری کی جگہ خود غرضی، ابتری، بے اطمینانی اور انتشار پھیلتا ہے۔ جرائم میں اضافہ ہو جاتا ہے اور سماجی عدم توازن جنم لیتا ہے جس سے سماجی بنیادیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔ بے روزگاری کی شرح میں بے حد اضافہ ہو جاتا ہے۔

ضرورت اس امر ہے کہ انسان خود اعتمادی اور خود اعتدالی سے کام لے اور توازن پیدا کرنے کی کوشش کرے تاکہ سرمایہ کاری کی راہیں ہموار ہوں۔ عوام کے روزگار اور آمدن میں اضافہ ہو اور غربت و افلاس میں کمی واقع ہو۔ ہمارا سماجی نظام، تاریخی، جغرافیائی اور نظریاتی عوامل کے زیرِ اثر تشکیل پاتا ہے۔ جس میں ہماری مذہبی اقدار سب سے اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ دنیا و آخرت پر ایمان، صداقت، بزرگوں کا احترام، والدین، رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے حقوق، ازدواجی زندگی میں وفاداری، سماجی انصاف، ایسی اسلامی اقدار ہیں کہ جن پر چل کر ہم اپنے بہت سے سماجی مسائل میں حوصلہ افزا کمی لا سکتے ہیں۔

(ماخوذ از ماڈیول تعلیم و ترقی آبادیات پراجیکٹ، شعبہ نصاب، وزارتِ تعلیم، حکومت پاکستان)

مشق

۱۔ متن کی مدد سے خالی جگہ پُر کریں۔

الف۔ وطنِ عزیز ایک ...ترقی پذیر... ملک ہے۔

ب۔ تخلیقِ آدم کے بعد نسلِ انسانی ...تیزی... سے پھیلنی شروع ہوئی۔

ج۔ درختوں کے بے تحاشا ...کٹاؤں... سے جنگل سکڑ گئے۔

د۔ تاکہ پوری ...نوعِ انسان... کے معیارِ زندگی کو بہتر کیا جا سکے۔

ہ۔ وطنِ عزیز بھی اسی طرح کے ...پیچیدہ حالات... سے دوچار ہے۔

و۔ بہتر معیارِ زندگی ہر فرد کا ...بنیادی... حق ہے۔

ز۔ جس میں ہماری ...مذہبی... اقدار سب سے اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

۲۔ معیارِ زندگی سے کیا مراد ہے؟ اس کو کس طرح بلند کیا جا سکتا ہے؟

۳۔ اگر وطنِ عزیز کی آبادی وسائل کے مطابق ہو تو وطن میں کیا متوقع تبدیلیاں رونما ہوں گی؟

۴۔ مندرجہ ذیل الفاظ کو جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے۔

وباؤ۔ منصوبہ بندی۔ خود اعتمادی۔ انتشار۔ پاسداری۔

۵۔ درج ذیل الفاظ پہ اعراب لگا کر درست تلفظ کے ساتھ لکھیں۔

تشکیل۔ معیار۔ امر۔ آخرت۔ توازن

۶۔ اپنے شہر کے میونسپلٹی کے ایڈمنسٹریٹر کو خط لکھیں اور شاپنگ بیگ کے نقصانات سے آگاہ کرتے ہوئے انھیں تلف کرنے کی تجاویز دیں۔

ہدایت برائے اساتذہ: طَلَبہ کے مابین ماحول کی آلودگی اور بڑھتی ہوئی آبادی کے مسائل پر مکالمے کروائیں۔

رتن ناتھ سرشار

پیدائش: ۱۸۴۶ء — وفات: ۱۹۰۳ء

پنڈت رتن ناتھ سرشار کا شمار اُردو ادب کے ممتاز ادیبوں میں ہوتا ہے۔ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد درس و تدریس سے وابستہ ہو گئے۔ تخلیق نگاری کا شوق اُنھیں اخبارات اور رسائل کی طرف کھینچ لایا، وہ مختلف رسالوں اور اخبارات کے مدیر رہے۔ مہاراجہ کشن پرشاد کی دعوت پر حیدر آباد چلے گئے اور ''دبدبۂ آصفی'' کے ایڈیٹر بن گئے۔ اُن کا انتقال ۱۹۰۳ء میں حیدر آباد میں ہوا۔

اُردو ناول کے ارتقا اور فروغ میں سرشار کا کردار ناقابلِ فراموش ہے۔ اُن کی تخلیقات فسانۂ آزاد، جامِ سرشار، اور سیرِ کہسار نے ایسی شہرت پائی کہ بہت سے نامی گرامی مصنّفین اور مصلحینِ قوم ناول نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کا ابتدائی ناول ''فسانۂ آزاد''، اخبارِ اودھ میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ ان کے ناولوں میں سیر سپاٹے، ہنسی مذاق اور عجیب و غریب کمالات موجود ہیں۔ ان کا قلم رواں دواں تھا اور انداز اتنا پختہ تھا کہ محیرالعقول واقعات پر بھی حقیقت کا گماں ہوتا تھا۔

دراصل اُن کا نظریہ تھا کہ ناول محض حظ اٹھانے اور وقت گزاری کا وسیلہ ہے۔ اُن کے ناولوں میں بالواسطہ مقصدیت اور اصلاح کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اُنھوں نے اپنی نثر کو آرائش سے محفوظ رکھا ہے۔ تاہم محاورات، روزمرہ اور تمثیل و تشبیہ کی معاونت سے اس کا رشتہ قدیم طرزِ تحریر سے جُڑتا نظر آتا ہے۔

تصانیف: شمس الضحیٰ، اعمال نامۂ روس، کامنی، الف لیلہ اور خُدائی فوجدار وغیرہ۔

داروغہ جی کی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں

(اس متن کی عبارت رتن ناتھ سرشار کے ناول ''فسانۂ آزاد'' سے انتخاب ہے۔ ''فسانۂ آزاد میں فنی لحاظ سے ناول کے خدوخال ملتے ہیں۔ اس کا پلاٹ ڈھیلا ڈھالا ہے۔ اس ناول میں لکھنؤ کی معاشرتی زندگی کی عکاسی ملتی ہے۔ لکھنؤ کی معاشرت کو ہلکے پھلکے طنز و مزاح کے ذریعے سامنے لایا گیا ہے جس سے قاری کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے۔ والیانِ اودھ کی شاہ خرچیاں، مالی معاملات اور کاروبارِ سلطنت سے غفلت کی سچی اور کھری تصویر پیش کی گئی ہے۔ اودھ کے نوابین کی غفلت اور عیش کوشی کا یہ عالم تھا کہ ان کے معمولی ملازمین روزمرہ اخراجات کی مد میں ان سے ہزاروں روپے بٹور رہے تھے۔ چاہے وہ داروغہ جی ہوں، بزاز یا پھر خوجی۔ سرشار نے لکھنؤ کی تہذیبی، سیاسی اور اخلاقی شکست و ریخت کو بڑی باریکی اور تفصیل کے ساتھ ''فسانۂ آزاد'' کا حصہ بنایا ہے۔ زیرِ نظر اقتباس میں بھی لکھنؤ کے عہد میں نوابان کے طرزِ زندگی، میاں آزاد اور خوجی کے ردِ عمل کو پیش کیا گیا ہے۔)

نواب: داروغہ جی! اس حلوائی کا حساب کر دو اور اس کو سمجھا دو کہ اگر خراب یا سڑی ہوئی باسی مٹھائی بھیجی تو اس سرکار سے نکال دیا جائے گا۔ پرسوں برفی خراب بھیجی تھی گھر میں شکایت کرتی تھیں۔

داروغہ: سنتے ہو جی شیودین! دیکھو سرکار کیا فرماتے ہیں؟ خبردار! جو گلی سڑی مٹھائی بھیجی تو تم جانو گے۔ اب تم نے نمک حرامی پر کمر باندھی ہے، کھڑے کھڑے نکال دیے جاؤ گے۔ ہاں! بس کہ دیا ہے تم سے۔ تمھارے بھائی بند سینکڑوں در چوم کے مٹھائی دیں گے مگر تم راندے ہی جاؤ گے۔

حلوائی: نہیں کھداوند! گلام کی کیا مجال۔ اول مال دوں اول مال، چاشنی جرا (ذرا) بہت آ گئی تو دانہ کم

پڑا۔ ملائم نہ رہی، کڑی ہو گئی۔ چاشنی کی گولی دیر میں دیکھی۔ نہیں تو یہی دکان کی برفی تو شہر بھر میں ماشور (مشہور) ہے۔ وہ لجّت (لذّت) ہوتی ہے کہ ہونٹ بند ھنے لگتے ہیں۔

داروغہ: چلو تمھارا حساب کر دیں، لے بتاؤ۔ کتنے دن سے خرچ نہیں پایا اور تمھارا کیا آتا ہے؟

حلوائی: جو حساب سے ہو۔

داروغہ: لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ!* اور ہم پوچھتے کیا ہیں۔ یہی تو پوچھتے ہیں کہ حساب سے کیا ہوا؟

حلوائی: اگلے مہینے میں پچیس روپے کچھ آنے کی آئی تھی اور اب کی دس تاریکھ (تاریخ) انگریجی (انگریزی) تک کوئی ستر یا اسی۔

داروغہ: اجی! تم تو گئے گذرے بازیاں کرتے ہو۔ ستر یا اسی یا سو۔ اس مہینے میں اتنی۔ اس مہینے میں اتنی۔ یہ بکھیڑا تم سے پوچھتا کون ہے؟ اس جھنجھٹ سے ہمیں واسطہ کیا بھلا، ہمیں تو بس گٹھڑی بتا دو کہ اتنا ہوا۔

حلوائی: اچھا حساب تو کر لوں (تھوڑی دیر کے بعد) بس ایک سو بیالیس روپے اور دس آنے دیجیے۔ چاہے حساب کر لیجیے، بولتا جاؤں؟

داروغہ: اجی! تم کوئی نئے تو ہو نہیں۔ اب بتاؤ! اس میں یاروں کا کتنا ہے۔ سچ بولنا لالہ! (پیٹھ ٹھوک کر) آؤ وارے نیارے ہوں۔ کیوں ہے نہ؟

حلوائی: بس سو ہم کا دے دیو۔ بیالیس تم لے لو۔ سیدھا سیدھا میں تو یہ جانتا ہوں۔

داروغہ: اچھا منظور، مگر بیالیس کے باون کرو۔ ایک سو تم لو باون ہمارے۔ سچ کہنا کوئی چالیس کی مٹھائی اُس مہینے اور اِس مہینے میں ملا کر آئی ہوگی یا کم؟

حلوائی: اجی ہجور! آپ کو اس بھید سے کیا واسطہ! آپ کو آم کھانے سے گَرَج (غرض) ہے یا پیڑ گننے سے اور سچ سچ یہ ہے کہ کوئی سب ملا کر اڑتیس روپے کی آئی ہوگی۔ مُل وَجَن (وزن) میں البتہ کتر بیونت کر دیتا ہوں، سیر بھر لڈو مانگ بھیجے۔ ہم نے پاؤ سیر کم کر دیے۔

* قدرے اضافے کے ساتھ۔

داروغہ: اونھ ! اس کی نہ کہیے۔ یہاں اندھیر نگری چوپٹ راجہ ہے۔ یہ دماغ کسے کہ تولنے بیٹھے۔ میاں لکھ لٹ، بیوی ان سے بڑھ کر۔ ڈنڈی ترازو کون لے بیٹھے۔ چین کرو۔ دس کے پچاس لو اور سیر کے تین پاؤ بھیجو۔ مزے ہیں۔ اچھا! یہ سو روپے گن لو اور ایک سو باون کی رسید ہمیں دو۔

حلوائی: یہ مول تول ہے۔ سو اور پانچ ہم لیں اور باکی (باقی) ہجور کو ممارک (مبارک) رہیں۔ مالملے (معاملے) کی بات ہے۔

الغرض داروغہ نے حلوائی کو راضی کرلیا۔ اس داروغگی کے صدقے اڑتیں روپے کے ایک سو باون دلوائے اور بیالیس سے زیادہ ہی زیادہ خود ہضم کیے۔ اے پھٹکار! کور نمک ایسے ہی ہوا کرتے ہیں جن رؤسا کے یہاں ایسے ایسے داروغہ اور اہلکار ہوں، ان کا خدا ہی حافظ ہے، مگر نواب صاحب کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ وہ خبر ہی نہ ہوئے کہ کیا دیا اور کیا لیا اور یار لوگوں نے حلوائی سے بالائی رقم اڑا ہی لی پھر وہ تو شیرِ مادر ہے۔

اب سنیے کہ میاں خوجی نے وہ ساری گفتگو سن لی جو داروغہ جی اور حلوائی میں ہوئی۔ جب داروغہ جی نے شیودین حلوائی کو ہنسی خوشی رخصت کیا تو خوجی نے بڑھ کر یوں کہا:

خوجی: اجی حضرت! آداب عرض ہے۔ کہیے! اس میں کچھ یاروں کا بھی حصہ ہے؟ یا باون کے باون خود ہی ہضم کر جاؤ گے اور ڈکار تک نہ لو گے؟ اب ہمارا اور آپ کا ساجھا نہ ہو گا تو بُری ٹھہرے گی۔

داروغہ: کیا! کس سے کہتے ہو؟ یہ ساجھا کیسا؟ آخر ہم بھی تو سنیں۔ بھنگ تو نہیں پی گئے ہو کہیں؟ یہ کیا واہی تباہی بک رہے ہو؟ ذرا سمجھ بوجھ کر بات زبان سے نکالا کیجیے۔ یہاں بیہودہ بکنے والوں کی زبان دست پناہ سے نکال لی جاتی ہے تم ٹکڑ گدوں کو ان باتوں سے کیا واسطہ؟

خوجی: (کمر کس کر) او گیدی! قسم خدا کی اتنی قرولیاں بھونکی ہوں کہ یاد کرے۔ مجھے بھی کوئی ایسا ویسا سمجھے ہو۔ میں آدمی کو دم کے دم میں سیدھا بنا دیتا ہوں۔ ذری کسی اور بھروسے نہ بھولیے گا۔ کیا خوب! اڑتیں کے ڈیڑھ سو دلوائے اور پچاس خود اڑائے اور اوپر سے غراتا ہے مردک۔ بہت داروغگی کے بھروسے نہ بھولیے گا۔ میں ابھی تو نواب صاحب سے سارا کچا چٹھا جڑتا ہوں، کھڑے کھڑے نہ

نکال دیے جاؤ تو سہی۔ ہم تمام عمر رئیسوں ہی کی صحبت میں رہے ہیں، گھانس نہیں چھیلا کیے ہیں۔ بائیں ہاتھ سے بیس روپے اِدھر رکھ دیجیے اور بیسیوں چہرہ شاہی ہوں۔ بس اسی میں خیر ہے، ورنہ الٹی آنتیں گلے پڑیں گی۔ اب سوچتے کیا ہو؟ ذرا چین چپڑ کرو، تو ابھی ابھی قلعی کھول دوں۔ یہ اکڑ نا وکڑ نا سب بھول جائے اور یوں تو بیس پر معاملہ ہوتا ہے۔ بولو۔ اب کیا رائے ہے؟ بیس روپے سے غم کھاؤ گے یا ذلت اٹھاؤ گے۔ پہلے تو بڑے گرم ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کھا ہی جاؤ گے، مگر اب موم ہو گئے۔ لے بس اب لائیے لائیے بیس چہرہ شاہی سامنے بسا دیجیے، ورنہ خیر نہیں نظر آتی۔ ابھی تو کوئی کانوں کان نہ سنے گا، پیچھے البتہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔

داروغہ: واہ ری پھوٹی قسمت! آج صبح صبح بوہنی تو اچھی ہوئی تھی۔ اچھے کا منہ دیکھ کر اُٹھے تھے، مگر حضرت نے اپنی منحوس صورت دکھائی۔ خدا جانے یہ ذات شریف کہاں سے سُن رہے تھے۔ لاحول ولاقوۃ! واہ رے! ہم اور واہ ری ہماری قسمت! کہیے اب باون میں سے آپ کو بیس ایک رقم کی رقم نکال دیں، تو ہمارے پاس کیا خاک رہے اور ہاں! خوب یاد آیا۔ بس باون کس مردود کو ملے۔ کل سینتالیس ہی تو ہمارے ہتے چڑھے۔ دس تم بھی لو بھئی! (ٹھوڑی میں ہاتھ ڈال کر) مان جاؤ استاد۔ ہمیں ضرورت تھی۔ اس سے کہا: ورنہ کیا بات تھی اور پھر ہم تم زندہ ہیں، تو سیکڑوں لوٹیں گے۔ میاں! یہ ہاتھ دونوں لُوٹنے اور رقم ہی پیرنے کے لیے ہیں یا کچھ اور۔

خوجی: دس میں تو ہمارا پیٹ نہ بھرے گا۔ اچھا بھئی! پندرہ دو۔

الغرض داروغہ نے مجبور ہو کر پندرہ روپے میاں خوجی کی نذر کیے اور دونوں آدمی جا کر شریکِ محفل ہوئے تو وہاں نواب صاحب کے فرشتے کو بھی خبر نہیں کہ یہاں کیا وارے نیارے ہوئے۔ وہاں شعر خوانی ہو رہی تھی۔

اتنے میں ایک بزاز آیا اور چوب دار نے آن کر کہا کہ: خداوند! چھاؤنی کا بزاز آیا ہے جو ولایتی کپڑا بیچتا ہے۔ کل بھی حاضر ہوا تھا مگر اس وقت موقع نہ تھا، میں نے عرض نہ کیا۔

نواب: داروغہ سے کہو۔ مجھ سے کیا گھڑی گھڑی آکے پرچہ جڑتے ہو۔ (داروغہ سے) جاؤ بھئی! ان کو بھی لگے ہاتھوں بھگتا ہی دو، جھنجھٹ کیوں باقی رہ جائے۔ کچھ اور کپڑا آیا ہے ولایت سے؟ آیا ہے تو دکھاؤ، مگر بابا مول کی سند نہیں۔

بزاز: اب کوئی دوج تک سب کپڑا آجائے گا اور ہجور ایسی بات کہتے ہیں۔ بھلا! اس ڈیوڑھی پر ہم نے کبھی بھی مول تول کی بات کی ہے۔ آج تک! اور یوں تو آپ امیر ہیں جو چاہیں کہیں، مالک ہیں ہمارے۔

داروغہ: چلو بھئی! حساب ہو جائے۔ اٹھو!

داروغہ اور بزاز چلے۔ جب داروغہ صاحب کی کھپریل میں دونوں کے دونوں جا کر بیٹھے تو میاں خوجی بھی رینگتے ہوئے چلے اور دَن سے موجود۔ داروغہ نے جو اُن کو دیکھا تو کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ مردنی سی چہرے پر چھا گئی۔ چپ؛ ہوائیاں اڑی ہوئیں۔ سمجھے کہ یہ خوجہ ایک ہی کائیاں ہے؛ دنیا بھر کا نیاریا ہے اس سے خدا پناہ میں رکھے۔ صبح کو تو مردود نے ہتے ہی پر ٹوک دیا اور پندرہ پٹیلے۔ اب جو دیکھا کہ بزاز آیا تو پھر موجود۔ آج رات کو اس کی ٹانگ نہ توڑی ہو سہی، ٹھہر تو جا تو۔ چچا ہی بنا کر چھوڑوں، تو سہی، مگر پھر سوچے کہ:

گڑ سے جو مرے تو زہر کیوں دو

آؤ اس وقت چنیں وچناں کریں، پھر سمجھا جائے گا۔

خوجی: داروغہ صاحب! سلام۔

داروغہ: آؤ بھائی جان! ادھر مونڈھے پر بیٹھو، اچھی طرح بھئی! حقہ لاؤ آپ کے لیے۔

بزاز صدر بازار کا رہنے والا۔ ایک ہی استاد۔ تاڑ گیا کہ اس کے بیٹھنے سے میرا اور داروغہ کا مطلب خبط ہو جائے گا۔ کسی تدبیر سے اس کو یہاں سے نکالنا چاہیے۔ پہلے تو کچھ دیر داروغہ سے اشاروں ہی اشاروں میں گفتگو ہوا کی اور پھر تھوڑی دیر کے بعد بزاز نے کہا کہ: میاں صاحب! آپ کو یہاں کچھ کام ہے؟

خوجی: تم اپنی کہو لالہ جی! ہم سے کیا واسطہ؟

بزاز: تم یہاں سے اُٹھ جاؤ۔ چلو۔ اٹھتے ہو کہ میں دوں ایک لات اُوپر سے۔

خوجی: اوگیدی! زبان سنبھال۔ نہیں تو اتنی قرولیاں بھونکوں گا کہ خون خرابہ ہو جائے گا۔

بزاز: اٹھوں پھر میں؟

خوجی: اُٹھ کے تماشا بھی دیکھ لو۔

بزاز: بیدھا ہے کیا؟

خوجی: واللہ جو بے تے کیا، تو اتنی قرولیاں۔

قرولیاں کہہ کر خوجی کچھ اور کہنے ہی کو تھے کہ بزاز نے بیٹھے بیٹھے منہ دبا دیا اور ایک چپت جمائی۔ چلیے دونوں گتھ گئے۔ اب داروغہ کی سنیے کہ بیچ بچاؤ کس مزے سے کرتے ہیں کہ خوجی کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور کمر دبائے ہوئے ہیں اور بزاز اوپر سے ان کو ٹھونک رہا ہے اور داروغہ صاحب گلا پھاڑ پھاڑ کر غُل مچائے جاتے ہیں کہ میاں! کیوں لڑتے مرتے ہو بھئی! دھول دھپے کی سند نہیں، زبانی ہی داخلہ رہے۔ خوجی اپنے دل میں جھلا رہے ہیں کہ اچھے میرِ فیصلہ بنے۔ اتنے میں کسی نے نواب صاحب سے جا کر کہہ دیا کہ میاں خوجی اور داروغہ صاحب اور بزاز تینوں گتھے پڑے ہیں تو ایک مصاحب بولے کہ بھئی! واللہ اچھی تگڈم ہے۔

اتنے میں بزاز دوڑا ہوا آیا اور نواب صاحب سے فریاد کی کہ ہجور (حضور) ہم آپ کے ہاں تو سستا مال دیتے ہیں، مگر یہ کھوجی (خوجی) حساب کتاب کے وکھت (وقت) نہ ٹلے، لاکھ لاکھ کہا: کہ بھئی! ہم اپنے مال کا بھاؤ تمھارے سامنے نہ بتائیں گے، مل انھوں نے ہاری مانی نہ جیتی اور الٹے پنجے جھاڑ کے چاپٹ کی ٹھہرائی۔ کمجور (کمزور) مار کھانے کی نشانی میں نے وہ گدّا دیا کہ چھٹی کا دودھ یاد کرتے ہوں گے۔ داروغہ بھی روتے پیٹتے آئے کہ دہائی ہے۔ چارپائی کی پٹی توڑ ڈالی، خاصدان توڑ ڈالا اور سینکڑوں ہی صلواتیں سنائیں۔

میاں خوجی ایسے دھپیائے گئے اور اتنی بے بھاؤ کی پڑیں کہ بس کچھ پوچھیے نہیں۔ داروغہ نے تو حضرت کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور بزاز نے تان تان کر لپڑ لگانے شروع کیے۔ خوجی نے دونوں کو گیدی اور مردک خر بنایا اور بہت کچھ ڈانٹ ڈپٹ کی کہ لانا میری قرولی، مگر ایک نے بھی شنوائی نہ کی۔ نواب صاحب کو جو خدامِ

باادب نے خبر کی تو بزاز دوڑ آیا اور معاً یہ فقرہ چست کیا کہ حضور! میں تو حساب کرنے آیا تھا مگر جس قیمت پر اس سرکار میں کپڑا فروخت کرتا ہوں اس قیمت پر کسی اور کے ہاتھ تھوڑا ہی بیچتا ہوں۔ خوجی وہاں داروغہ جی کے پاس ڈٹے بیٹھے تھے۔ میں سوچا کہ سب قسم کے کپڑوں کی قیمت سے واقف ہو جائیں گے اور صورت سے آدمی کھوٹے معلوم ہوتے ہیں، ان سے ڈرنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ: خوجی صاحب! آپ ذرا اس وقت باغ میں ٹہلیے تو ہم حساب کرلیں۔ بس اس پر آنکھیں نیلی پیلی کر کے لام کاف بکنے لگے۔ نواب کے دل میں یہ بات کھب گئی۔ خوجی اور داروغہ اور بزاز تینوں کو بلوایا اور اظہار لینے شروع کیے۔

نواب: داروغہ صاحب! یہ کیا جھگڑا تھا؟ بھئی! تم تو بیٹھے بیٹھے خوب مینڈھے لڑا دیتے ہو۔

داروغہ: حضور! یہ خوجی صاحب تو بڑے ہی تیکھے آدمی ہیں۔ بات بات پر قرولی بھونکتے ہیں اور گیدی تو تکیۂ کلام ہے۔ حضرت! تا گے باشد۔ یہ بے گیدی بنائے نہ چھوڑیں گے۔ اس وقت لالہ بلدیو ہی سے بھڑ پڑے۔ اب میں لاکھ ہاں ہاں کرتا ہوں۔ سمجھاتا ہوں وہ ہاری مانتے ہیں، نہ جیتی۔ وہ تو یہ کہیے میں نے بیچ بچاؤ کر دیا ورنہ ایک آدھ کا سر ہی پھوٹ جاتا۔

بزاز: بڑے بھلے آدمی ہیں، وہ تو دروگا (داروغہ) بچرو (بیچارے) نہ آ جائیں تو کپڑے وپڑے پھاڑ ڈالیں۔

خوجی: نواب روتے کاہے کو ہو، جو ہوا سو ہوا۔ آئی گئی بات ہوگئی۔ اب یہ دکھڑا لے کے کیا بیٹھے ہو۔

نواب: لپا ڈگی تو نہیں ہوئی؟

خوجی: نہیں حضور! شریفوں میں کہیں ہاتھا پائی ہوتی ہے۔ بھلا! ہم نے ان کو للکارا۔ انھوں نے ہم کو ڈانٹا مگر کندے تول تول کے دونوں رہ گئے۔ بھلے مانس پر ہاتھ اٹھانا کچھ دل لگی ہے اور پھر شریف کہیں پٹ کے آتے ہیں۔

...تامیں خوجی نواب کی محفل میں جا کر بیٹھے اور ادھر لالہ بلدیو اور داروغہ صاحب گئے کہ حساب

داروغہ: ہاں بھئی! لالہ بتاؤ۔

لالہ: اجی بتائیں کیا جو چاہو، دلوا دو۔

داروغہ: پہلے یہ بتاؤ کہ تمھارا آتا کیا ہے؟ سو دو سو۔ دس بیس پچاس جو ہو کہہ دو۔

لالہ: دروگا جی! آج کل کپڑا بڑا مہنگا ہے۔

داروغہ: لالہ! تم نرے گاؤدی ہی رہے۔ اجی! ہم کو گراں اور ارزاں سے کیا واسطہ۔ ہم کو اپنے حق سے مطلب ہے۔ تم تو اس طرح کہتے ہو جیسے ہماری گرہ سے جاتا ہے۔

لالہ: پھر اب کی سات سو تر پن روپے نکالیے۔

داروغہ: سات سو ترپن۔ بس! ارے میاں! اب کے اتنے دنوں میں بس سات ساڑھے سات سو ہی کی نوبت آئی؟

لالہ: جی ہاں! اجی آپ سے تو کچھ پردہ ہی نہیں۔ دو سو اور چھبیس روپے کا کپڑا آیا ہے۔ اندر باہر سب ملا کے، مگر پرسوں تو نواب صاحب کہنے لگے کہ اب کے تو تمھارا کوئی پانچ چھے سو کا مال آیا ہوگا۔ میں نے کہا کہ: ایسے موکے (موقع) پر چوکنا گدھا پن ہے۔ وہ تو پانچ سو بتاتے تھے۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ حساب کیے سے معلوم ہو۔ کل کوئی سات آٹھ سو کا آیا ہوگا۔ تو اب سات سو ترپن ہی رکھیے۔ اس میں ہمارا آپ کا سمجھوتہ ہو جائے گا۔

داروغہ: اجی! سمجھوتہ کیسا۔ ہم تم کچھ دو تو ہیں نہیں اور ہمارے تمھارے تو باپ دادا کے وقت کے مراسم ہیں۔ تم تو مثل اپنے عزیزوں کے ہو۔ لے بولو۔ کتنے پر فیصلہ ہوتا ہے، بتاؤ۔

لالہ: بس دو سو چھپن تو ہم کو ایک دیجیے اور تین سو اور دیجیے۔ اس کے بعد جو بڑھے وہ آپ کا۔

داروغہ: ٹھہرو میں حساب تو لگا لوں۔ دو اور تین پانچ ہوئے تو پانچ سو چھپن تو تم لو۔ اور وہاں بچا کیا۔ سات سو ترپن میں سے پانچ سو چھبیس گئے تو کتنے بچے؟

لالہ: دو سو ستائیں۔

داروغہ: (قہقہہ لگا کر) اچھا بھئی منظور! ہاتھ پر ہاتھ مارو۔

لالہ: پھر دلوایئے تو چلیں۔

داروغہ: ابھی لو۔ گھبراتے کیوں ہو؟

داروغہ نے پانچ سو چھبیس روپے بزاز کے حوالے کیے اور دو سو ستائیس نلوہ اڑائے۔ بزاز جانے لگا تھا کہ داروغہ نے پھر پکارا۔

داروغہ: بھئی! سنتے ہو۔ سات سو ترپن روپے چھ آنے لکھ لو، تا کہ معلوم ہو کہ آنے پائی سے حساب لیس ہے۔

لالہ (مسکرا کر) بڑے کائیاں ہو در وگا جی! اجی! دو سو ستائیس روپیہ چھے آنہ کُل آپ کا۔

آواز: ''بلکہ آپ کے باپ کا۔''

جیسے ہی داروغہ اور لالہ میں باہم گفتگو ہو چکی ویسے ہی ایک موکھے میں سے آواز آئی۔ لالہ نے کہا: کُل آپ کا اور آواز آئی کہ: ''بلکہ آپ کے باپ کا۔'' تب تو دونوں چوکنے ہوئے کہ بھئی! یہ کون بولا؟ اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں۔ کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ سخت حیرت ہے کہ یا الٰہی! یہ کون بولا؟ داروغہ کے حواس غائب۔ بزاز کے بدن میں خون کا نام نہیں کہ اتنے میں پھر آواز آئی: ''کہو! کچھ یاروں کا بھی حصہ ہے؟'' تب تو دونوں کے رہے سہے ہوش اور بھی اُڑ گئے کہ یہ اسرار کیا ہے؟

اب سنیے کہ جب خوجی نواب نامدار کی بزمِ عشرت بار میں بیٹھے تو داروغہ اور بزاز دونوں کو ڈھارس ہوئی کہ اب یہ بلا ٹلی اور پھر وہ سوچے کہ پٹ پٹا کر اب کس منہ سے میاں خوجی یہاں آئیں گے، لیکن خوجی ایک ہی بے حیا۔ راستے بھر یہی خیال تھا کہ وہ لوگ مطمئن ہو کر وارے نیارے کر رہے ہوں گے تو چپکے سے کسی بہانے اُٹھے اور اُٹھ کر کھپریل کے پچھواڑے ایک موکھے کی راہ سے سب سنا کیے۔ جب کُل کارروائی ختم ہوگئی، تو فرمایا کہ: (بلکہ آپ کے باپ کا) خیر۔ داروغہ اور لالہ بلدیو نے ان کو ڈھونڈ نکالا اور للو پتو کرنے لگے۔

بزاز: ہمارا کسور (قصور) ما پھ (معاف) کیجیے۔

داروغہ: اجی! یہ ایسے آدمی نہیں۔ یہ بے چارے کسی سے لڑنے بھڑنے والے نہیں۔ اپنے کام سے کام

ہے۔ باقی لڑائی جھگڑا تو ہوا ہی کرتا ہے۔ دل میں کدورت آئی اور صاف ہو گئے۔

خوجی: یہ باتیں تو عمر بھر ہوا کریں گی۔ مطلب کی بات فرمایئے۔

داروغہ: جو ارشاد ہو۔

خوجی: لاؤ پھر کچھ اِدھر بھی۔

داروغہ: جو کہو۔

خوجی: سو دلوایئے۔ پورے ایک سو لیے بغیر نہ ٹلوں گا۔ آج تم دونوں نے مل کر خوب ہماری مرمت کی ہے اور ہمارے پاس اتفاق سے قرولی نہ تھی۔

داروغہ: یہ تیس روپے تو ایک لیجیے اور یہ دس کا نوٹ بس۔ اور جو السیٹھ کیجیے تو اس سے بھی ہاتھ دھویئے۔

خوجی: اجی! ازخرس موئے بس ست۔ لایئے چالیس کیا کم ہیں۔

بزاز: کھاسی رکم کی رقم ہے (خاصی رقم کی رقم ہے)

خوجی: تمھاری بھی پانچوں گھی میں ہیں اور سر کڑاہی میں ہے۔

داروغہ: (اپنے دل میں) اچھے ملے۔ ہم سمجھے تھے کہ بس ہم ہی ہم ہیں مگر یہ ہمارے بھی گرو پیدا ہوئے۔ جب دیکھو ساجھے کو مستعد۔ اچھا پیٹا مار امگر اب ان کے دن بھی پورے ہو گئے۔

(فسانۂ آزاد)

مشق

۱۔ بزاز، داروغہ اور میاں خوجی کے درمیان ہونے والے معاملے کو اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۲۔ داروغہ اور حلوائی میں کیا معاملہ طے پایا؟

۳۔ اس اقتباس کی روشنی میں داروغہ کے کردار پر ایک پیراگراف لکھیے۔

۴۔ درج ذیل محاورات اور ضرب الامثال کو اس طرح جملوں میں استعمال کریں کہ ان کا مطلب واضح ہو جائے۔

اندھیر نگری چوپٹ راجہ۔

۵۔ اس عبارت کی روشنی میں بتایے کہ اُس وقت لکھنؤ کے نوابوں کے کیا رنگ ڈھنگ تھے۔

۶۔ کسی پیشے یا طبقے کے لوگ تبادلہ خیال کے لیے الفاظ کو وضعی کی بجائے کچھ اور مخصوص معانی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ایسے الفاظ کو سلینگ کہا جاتا ہے جیسے سیاسی وفاداری بدلنے والے شخص کو ''لوٹا'' کہنا۔
آپ ایسے ہی کوئی سے پانچ سلینگ تلاش کر کے نئے معانی کی وضاحت کے ساتھ لکھیں۔ نیز درج ذیل سلینگ

۷۔ درج ذیل الفاظ کے معنی لکھیے۔

۸۔ آپ کو اس ناول کا کون سا کردار اچھا لگا اور کیوں؟

۹۔ اس ناول پر زبان و بیان کے حوالے سے تبصرہ کریں۔

ہدایت برائے اساتذہ: طلبہ کو کردار نگاری کی تعریف اور کرداروں کی اقسام سے متعارف کروائیں۔

خدیجہ مستور

پیدائش: ۱۲/دسمبر ۱۹۲۷ء وفات: ۱۹۸۲ء

خدیجہ مستور بریلی کے ایک پٹھان گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ اُن کی والدہ انور جہان خود ایک اچھی شاعرہ اور مضمون نویس تھیں۔ اس طرح دونوں بہنوں خدیجہ مستور اور حاجرہ مسرور کو علمی و ادبی ماحول ملا۔ خدیجہ کی ابتدائی زندگی سخت مشکلات میں گزری۔ انھوں نے ادبی زندگی کی ابتدا ۱۹۳۶ء میں افسانہ نگاری سے کی لیکن ان کی اصل شہرت آدم جی انعام یافتہ ناول ''آنگن'' کی وجہ سے ہے۔ اس ناول میں انھوں نے سماجی حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے ایک پورے عہد کی آویزش اور کشمکش کو بڑی کامیابی اور خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔ قیامِ پاکستان کے پس منظر میں بے شمار ناول اور افسانے لکھے جا چکے ہیں لیکن آنگن کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں ایک متوسط مسلمان خاندان کی سماجی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ناول کا کینوس اور پلاٹ بہت مختصر ہے لیکن اس کے باوجود یہ ناول اُس عہد کی سماجی اور معاشی ناہمواری کی ایک مکمل اور سچی تصویر پیش کرتا ہے۔ یہ ایک عام گھرانے کی کہانی ہے۔ جو سادہ اور عام فہم انداز میں بیان کی گئی ہے۔ خدیجہ نے اپنی کہانیوں میں زیادہ تر عورتوں کے مسائل کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے اس نظام کے خلاف آواز اُٹھائی ہے۔ جو عورتوں کو ایک خاص جبر کے تحت رکھتا ہے۔ ان کا اندازِ تحریر بہت سادہ اور دلکش ہے۔

تصانیف: آنگن، زمین، بوچھاڑ، چندروز اور، تھکے ہارے، ٹھنڈا میٹھا پانی وغیرہ

آنگن

(خدیجہ مستور کا ناول ''آنگن'' ایک کرداری ناول ہے۔ یہ ناول تحریک پاکستان سے قیام پاکستان تک کے زمانے پر محیط ہے۔ عالیہ اس ناول کا مرکزی کردار ہے اور اسی مرکزی کردار کے ذریعے پوری کہانی قاری تک پہنچتی ہے۔ عالیہ اپنے سرکاری ملازم باپ کی موت کے بعد اپنے دوودھیال کے آبائی گھر میں اپنی اماں کے ساتھ آجاتی ہے۔ چھمی، عالیہ کی چچازاد بہن ہے۔ چھمی کی ماں کی مَوت کے بعد اس کا باپ دوسری شادی کرلیتا ہے اور اسے اپنے بڑے بھائی کے گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور کبھی پلٹ کر خبر نہیں لیتا۔ بس ہر مہینے برائے نام خرچہ بھیج دیتا ہے گویا حالات کا جبر عالیہ اور چھمی کو بڑے چچا کے آنگن میں لے آتا ہے اور یوں وہ اُس آنگن کا حصہ بن جاتی ہیں، جو ملک کی تقسیم کا گواہ ہے کیونکہ اس آنگن میں اُس دور کے مختلف سیاسی خیالات کے نمائندے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً بڑے چچا کٹر کانگرسی سوچ کے مالک ہیں، جب کہ جمیل بھیا اور چھمی اس دور کے عام مسلمان نوجوانوں کی نمائندگی کرتے ہیں، وہ مسلم لیگ اور پاکستان سے محبت کرنے والے کردار ہیں۔ عالیہ کی امّاں ذہنی طور پر انگریز نواز کردار ہے۔ کریمن بوا کوئی سیاسی یا نظریاتی کردار تو نہیں لیکن مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی یادگار ضروری ہے۔ اس ناول کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُس دور کے تمام تر سیاسی معرکوں کو ایک چھوٹے سے آنگن میں متحرک کرداروں کے ذریعے پوری شدت کے ساتھ دکھایا گیا ہے)۔

امتحان کے بعد جب عالیہ نے سر اُٹھایا تو بہار جا چکی تھی۔ ہواوں میں گرمی بس گئی تھی۔ نالی سے ڈھیروں پانی کیاری میں جاتا مگر پھولوں پر رونق نہ آتی۔ پتیاں مرجھا مرجھا کر جھڑتی رہیں، مارے پیاس کے ننھی ننھی چڑیوں کی چونچیں کھلی رہتیں اور چولھے کے پاس کام کرنے والی کریمن بوا کے ہاتھ سے پنکھیا نہ چھوٹتی۔ شام کو صحن ٹھنڈا کرنے کے لیے کتنی ہی پانی کی بالٹیاں چھڑک دی جاتیں، پھر بھی سکون نہ ملتا۔ سارا ماحول جل رہا تھا۔

ان بے کار، ویران اور گرم دنوں میں بڑی چچی نے چھمی کے جہیز کے پانچ جوڑے کپڑے اس کے سپرد کر

دیے تھے۔ دوپہر میں جب سناٹا چھا جاتا تو وہ مشین پر کپڑے سینے بیٹھ جاتی۔ بڑی چچی سے تو اب کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔ ہر وقت بجھی بجھی سی رہتیں۔ ان کا کسی کام میں جی نہ لگتا اور امّاں تو ویسے بھی چھمی کو برداشت نہ کرتیں۔ ان کا بس چلتا تو جہیز کے کپڑوں سے چھمی کا کفن سی ڈالتیں۔ بس ایک عالیہ رہ گئی تھی جو بڑے خلوص سے جہیز سی رہی تھی اور ہر وقت چھمی کے اچھے نصیب ہونے کی دُعائیں کر رہی تھی۔

ادھر چھمی تھی کہ اپنے نصیب کی بازی لگنے سے بے خبر سارے گھر میں اودھم ڈھاتی پھر رہی تھی۔ بڑے چچا کو دیکھتے ہی اسے پاکستان کا خیال ستانے لگتا۔ انگریزوں کو وہ بے نقط سناتی کہ امّاں کے چھکے چھوٹ جاتے اور جب سب کو چڑا کر وہ تھک جاتی تو پھر عالیہ کے پاس آگھستی...... ''اے بجیا! یہ کس کے کپڑے سل رہے ہیں۔ ہے اللہ کتنے پیارے ہیں۔ یہ کون پہنے گا؟'' وہ اِٹھلا کر پوچھتی۔

''کسی کے ہیں چھمی''۔ عالیہ بہانہ کرتی کہ کہیں سچی بات کا پتا نہ چل جائے۔

''ایک دوپٹا ہمیں دے دیجیے اس میں سے، لچکا لگا کر اوڑھوں گی''۔ وہ چنے ہوئے دوپٹے کو اُٹھا کر مروڑنے لگتی...... دیکھیے! میرا دوپٹا کیسے لتے ہو رہا ہے''۔

چھوڑو چھمی! چنٹ کھل جائے گی'' عالیہ دوپٹا چھیننے لگتی

''آخر یہ ہیں کس کے جہیز کے، بچاری بتا بھی نہیں سکتیں، زبان تھکتی ہے''۔ مارے تجسس کے چھمی لڑنے پر آمادہ ہو جاتی۔

''میں تم کو پیٹوں گی جو مجھ سے لڑیں''۔ عالیہ بڑے پیار سے اپنی بڑائی کا رعب ڈالتی تو چھمی ہنسنے لگتی۔

آج دوپہر میں کیسا سناٹا ہے۔ وہ چھمی کے دوپٹے میں کرن ٹانک رہی تھی اور اپنے مستقبل کے خیالوں کی جان پر نازل کیے جا رہی تھی........ اگر وہ فیل ہوگئی، تو کیا ہوگا، اگر پاس ہوگئی تو لے دے کہ ایک ہی بات رہ جاتی کہ بی ٹی کرے؛ استانی بن جائے، مگر کیا وہ بی ٹی کر سکے گی؛ کیا امّاں اسے علی گڑھ جانے دیں گی اور کیا ماموں اسے اِتنے روپے بھجواتے رہیں گے؟

ہائی سکول کے احاطے میں آم کے درختوں پر کوئل مسلسل چیخے جا رہی تھی اور پاس کے کمرے میں سوئی

ہوئی نجمہ پھوپھی کے خراٹے چھت سر پر اٹھائے ہوئے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھی سو جائے اور اتنے خراٹے لے کہ نجمہ پھوپھی اپنی بے فکر نیند سے چونک پڑیں اور پھر ساری دوپہر بیٹھ کر کاٹ دیں۔

شام کو جب وہ نیچے اُتری تو کریمن بوا صحن میں پانی چھڑک رہی تھی۔ جمیل بھیا لوہے کی کرسی پر بیٹھے انگلیاں مروڑ رہے تھے اور بڑے چچا برآمدے میں ٹہل ٹہل کر جیسے کسی کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کا چہرہ اترا ہوا تھا اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ بڑی چچی سب سے بے نیاز تخت پر بیٹھی آلو چھیل رہی تھیں۔

''بڑے چچا! آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''سر میں درد ہے بیٹی''۔

بڑی چچی نے چونک کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا..... ''کریمن بوا جلدی سے پلنگ بچھا دو، بس صحن ٹھنڈا ہو گیا''۔

''ناس جائے اس درد کا''۔ کریمن بُوا برآمدے میں ایک طرف کھڑے ہوئے پلنگ اُٹھا اُٹھا کر آنگن میں بچھانے لگیں۔

بڑے چچا جمیل بھیا کی طرف کروٹ لے کر لیٹ گئے۔ عالیہ کو سخت کوفت ہو رہی تھی کہ بیٹا پاس بیٹھا ہے مگر باپ کو پوچھتا تک نہیں۔ کتنا عرصہ ہو گیا، دونوں کے درمیان بات چیت بند تھی۔

''تم آج دو دن سے گھر میں کیوں بیٹھے رہتے ہو؟'' بڑی چچی نے جمیل بھیا کی طرف دیکھا۔

''نوکری چھٹ گئی ہے امّاں، سرکاری دفتروں میں سیاسی لوگوں کا گزارا مشکل ہی سے ہوتا ہے''

عالیہ نے جل کر جمیل بھیا کی طرف دیکھا۔

''مسلم لیگیوں کی کھپت تو انگریز بہادر کے دفتر ہی میں ہوتی ہے'' بڑے چچا نے کروٹ بدلے بغیر کہا۔

''آپ کا خیال غلط ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ جب کانگرسی سفارش کر دیتے ہیں تو پھر نوکری مل جاتی ہے''۔ جمیل بھیا بھی کیوں چُپ رہتے۔

''ہوں''

باپ بیٹے دونوں اپنے اپنے طنز کی آگ میں جل کر خود بخود بجھ گئے اور دونوں نے اس طرح منھ پھیر لیا

جیسے ایک دوسرے کو بات کرنے کے لائق نہ سمجھ رہے ہوں۔ عالیہ نے جمیل بھیا کو ملامت بھری نظروں سے دیکھا اور بڑے چچا کے پاس بیٹھ کر ہولے ہولے سر سہلانے لگی۔ امّاں گیلے بال جھٹکتی ہوئی غسل خانے سے نکل آئیں اور سب کو ایک جگہ جمع دیکھ کر بڑی بے زاری سے پاندان اُٹھا کر آخری پلنگ پر جا بیٹھیں۔

''اب کیا ہوگا'' بڑی چچی نے جمیل بھیا سے پوچھا۔

''فکر نہ کیجیے امّاں، ایک بڑی اچھی نوکری ملنے والی ہے، آپ سب کے ٹھاٹ ہو جائیں گے''

''شکیل کی پھر کوئی خیریت معلوم ہوئی یا نہیں؟'' بڑی چچی نے اچانک پوچھا۔

''امّاں اس کی فکر نہ کیا کیجیے، وہ بڑے مزے میں ہے۔ یہاں کے سارے دکھ درد بھول گیا ہوگا''۔ جمیل بھیا نے پھر صفائی سے جھوٹ بولا۔ انھوں نے عالیہ کو ساری حقیقت بتا دی تھی کہ انھیں شکیل کا پتا تک نہیں معلوم۔

''خیر جہاں رہے خوش رہے''۔ بڑی چچی نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''بڑے چچا! آپ کا پلنگ باہر چبوترے پر بچھوا دوں، کھلی فضا میں درد کم ہو جائے گا''۔ عالیہ نے پوچھا۔ دو مختلف کٹر نظریات ایک جگہ جمع ہو جاتے، تو اسے ڈر لگنے لگتا۔ شکیل کے ذکر سے وہ پریشان تھی۔ جمیل بھیا موقع چوکنے کا نام نہ لیتے۔

''ہاں! وہیں لگوا دو، تو بڑا اچھا ہو''۔ بڑے چچا نے اسے ممنونیت سے دیکھا اور پھر باہر جانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

گلی میں کانگرسی بچوں کا جلوس نکل رہا تھا۔ وہ بڑے بے ہنگم طریقے سے شور مچا رہے تھے: ''جھنڈا اُونچا رہے ہمارا..... کانگرس زندہ باد، گاندھی جی زندہ باد، جواہر لال نہرو زندہ باد۔ ہندوستان نہیں بٹے گا۔ جھنڈا اُونچا رہے ہمارا.......''

بڑے چچا کے ہونٹوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُن کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ جمیل بھیا ہنس رہے تھے اور امّاں جو بڑی دیر سے چُپ بیٹھی چھالیہ کاٹ رہی تھیں، آخر بول ہی پڑیں: ''پہلے آزادی تو مل جائے، پھر سب ہوتا رہے گا اور پھر یہ ہندوستانی لوگ پہلے حکومت کرنا بھی تو سیکھ لیں''۔

سب چُپ رہے۔ کسی نے اماں کو جواب نہ دیا۔ باہر بڑے چچا کا بستر لگ گیا تھا۔ وہ چلے گئے اور جمیل بھیا پھر انگلیاں مروڑنے لگے۔ جلوس کا شور دروازے کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ چھمی دیوانوں کی طرح بھدر بھدر کرتی اپنے کمرے سے نکل پڑی...... ''اگر میرے دروازے کے پاس سے جلوس نکلا تو ڈھیلے ماروں گی'' وہ دروازے کی طرف لپکی۔

''خبردار! جو آگے بڑھیں، بیٹھ جاؤ چپکے سے''۔ جمیل بھیا زور سے گرجے اور چھمی جانے کیسے رعب میں آ گئی۔ اس نے جمیل بھیا کو گھور کر دیکھا اور بڑبڑانے لگی...... ''ہونہہ! بڑے آئے بیچارے، آج ہی مسلم لیگ کا جلوس نہ نکالا ہو تو میرا نام بھی چھمی نہیں''۔

جلوس دروازے کے پاس سے گزر گیا تو جمیل بھیا کپڑے بدل کر باہر چلے گئے۔ چھمی جیسے ان کے باہر جانے کا انتظار کر رہی تھی۔ جمیل بھیا کے جاتے ہی برقع اوڑھ کر خود بھی باہر نکل گئی۔ عالیہ اسے نہ روک سکی۔

زمانے زمانے کی بات ہے، پہلے تو جب بی بیاں گھروں سے نکلتیں، تو دو دو چار چار مامائیں ساتھ ہوتی تھیں''۔ کریمن بُوا چھمی کے یوں باہر نکل جانے پر ہمیشہ کڑھا کرتیں۔

عالیہ نے کواڑوں کی اوٹ سے جھانک کر باہر دیکھا۔ بڑے چچا صاف ستھرے بستر پر پاؤں پھیلائے سکون سے لیٹے تھے۔ سامنے پیپل کے گھنے درخت سے چاند کی روشنی اُبھرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ عالیہ کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی باہر چبوترے پر جا بیٹھے۔

''عالیہ! بیٹی ایک پان کھلا دو''۔ بڑی چچی نے فرمائش کی تو وہ تخت پر آ بیٹھی اور پان دان کھول کر پان بنانے لگی...... وہ باہر چبوترے پر جا کر نہیں بیٹھ سکتی۔ اسے عجیب سی بے بسی کا احساس ہو رہا تھا۔

محلے کی مسجد سے اذان کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے مارے احترام کے ساری کا پلو سر پر ڈال لیا۔ کریمن بُوا جلدی جلدی لالٹینیں جلا رہی تھیں۔

''اللہ شکیل کو خیریت سے رکھیو'' بڑی چچی دونوں ہاتھ پھیلا کر دُعا کرنے لگیں۔ وہ اس وقت کتنی دکھی اور مامتا سے بھرپور نظر آ رہی تھیں۔

اندھیرا ہر طرف در آیا تھا مگر چھمی اب تک گھر نہیں لوٹی تھی۔ عالیہ کو خواہ مخواہ فکر ہو رہی تھی۔ ویسے گھر میں اور کسی نے نہ پوچھا کہ وہ ہے کہاں؟

ذرا دیر بعد چھمی آئی تو منہ سرخ ہو رہا تھا، سانس پھولی ہوئی تھی......

''اے بجیا! میں نے وہ شاندار جلوس تیار کرایا ہے کہ آپ دیکھتی رہ جائیں گی۔ بس ذرا دیر میں اِدھر سے گزرنے والا ہے۔ عذرا کی اماں نے جھنڈا بنایا؛ طاہرہ کی اماں نے ایک بوتل مٹی کا تیل دیا تھا؛ میں نے مشعلیں تیار کیں؛ سارے محلے کے لڑکوں کو جمع کر دیا ہے۔ ہائے! بڑے چچا دیکھیں گے تو آنکھیں کھل جائیں گی۔ میں نے سارے لڑکوں کو سمجھا دیا ہے کہ میرے دروازے پر آ کر خوب نعرے لگانا''.... چھمی ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گئی اور پھر برقع پھینک کر جلوس کے انتظار میں ٹہلنے لگی۔

خوشیوں کا کوئی پیمانہ اُس وقت چھمی کی مسرّت کو ناپ نہیں سکتا تھا۔ عالیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پریشان ہو رہی تھی کہ کہیں یہ ننھے منے بچوں کا جلوس گھر میں فساد نہ کرا دے۔ اس نے یہی بہتر سمجھا کہ اُوپر اپنے کمرے میں کھسک لے۔ دور سے بچوں کے نعروں کی آواز آ رہی تھی۔

بڑے کمرے سے گزرتے ہوئے اُس نے دیکھا کہ نجمہ پھوپھی اپنے صاف ستھرے بستر پر لیٹی کوئی موٹی سی کتاب پڑھ رہی ہیں۔ گرمیوں میں چھت پر نجمہ پھوپھی کا ڈیرہ جمتا تھا، اس لیے وہ اپنے کمرے کے پاس والی چھوٹی چھت پر گزارہ کر لیتی۔

جلوس قریب آ گیا تھا۔ بچے بڑے زور زور سے نعرے لگا رہے تھے: ''مسلم لیگ زندہ باد، قائدِ اعظم زندہ باد، بن کے رہے گا پاکستان، دھتیا راج نہیں ہوگا، چٹیا راج نہیں ہوگا''۔

عالیہ چھت کی منڈیر سے جھک کر گلی میں جھانکنے لگی۔ دو بڑے لڑکے مشعلیں اٹھائے سب سے آگے تھے۔ ''نہیں دیکھنے دیا ظالم نے'' ...... چھمی بھاگتی ہوئی آئی اور عالیہ کے برابر کھڑی ہو کر نیچے گلی میں آدھی لٹک گئی...... ''ہائے! کیسا شاندار جلوس ہے۔ وہ آپ کے بڑے چچا نے مجھے دروازے سے جلوس نہیں دیکھنے دیا، جل کر خاک ہو گئے حضرت''۔

چھمی! ذرا سرک کر جھانکو، کہیں جلوس کے ساتھ تمھاری لاش نہ نکل جائے'' عالیہ نے چھمی کے لٹکتے ہوئے دھڑ کو اپنی طرف کھینچا۔

''ہائے بجیا! میں نے مشعلیں کیسی اچھی بنائی ہیں، ہیں نا؟'' چھمی نے داد طلب نظروں سے دیکھا..... آج تو آپ کے بڑے چچا جلتے جلتے ختم ہو جائیں گے''۔

چھمی! کیسی باتیں کرتی ہو، بس پتا چل گیا کہ تم لیگی ویگی کچھ نہیں ہو، بڑے چچا کو جلانے کے لیے یہ سوانگ رچایا ہے۔''

''واہ، ہوں کیوں نہیں۔'' وہ شرمندہ سی ہو گئی اور عالیہ کے گلے میں ہاتھ ڈال کر جھول گئی۔

جلوس گلی کے موڑ پر غائب ہو گیا تو تھکی تھکی سی چھمی عالیہ کے بستر پر لیٹ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی اور عالیہ خاموشی سے ٹہلتی رہی۔۔۔اب کتنے دن یوں سب کو جلانے چھمی بیٹھی رہے گی۔ آخر تو ایک دن اپنے گھر چلی ہی جائے گی، جانے وہ گھر بھی اس کا گھر بنے گا کہ نہیں۔ چھمی کو وہاں محبت ملے گی یا نہیں۔ کیا وہاں بھی وہ سب سے بدلے چکانے کے طریقے ایجاد کر کر کے زندگی گزارے گی۔

''عالیہ بٹیا اور چھمی بٹیا، دونوں کھانا کھانے نیچے آجاؤ۔'' کریمن بُوا کی آواز آئی۔ (آنگن)

مشق

ا۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات تحریر کریں۔

ا۔ عالیہ کس کے جہیز کے کپڑے سی رہی تھی؟

ب۔ بڑے چچا کو دیکھ کر چھمی کو کیا خیال ستانے لگتا؟

ج۔ جمیل اور بڑے چچا میں اختلاف کی کیا وجہ تھی؟

د۔ کانگرسی جلوس دیکھ کر چھمی نے کیا ردِعمل ظاہر کیا؟

ہ۔ کیا چھمی واقعی مسلم لیگی تھی؟

و۔ بڑے چچا کو چبوترے پر لیٹے دیکھ کر عالیہ کے دل میں کیا خواہش پیدا ہوئی؟

۲۔ چھمی کے کردار پر چند سطریں لکھیں۔

۳۔ درج ذیل الفاظ و محاورات کو جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کے معنی واضح ہو جائیں۔

بے نقط سنانا، تجسس، کوفت ہونا، بے ہنگم، مبہم، سوانگ رچانا۔

۴۔ درج ذیل جملوں کی وضاحت کریں۔

ا۔ باپ بیٹے دونوں اپنے اپنے طنز کی آگ میں جل کر خود بخود بجھ گئے اور دونوں نے اس طرح منہ پھیر لیا جیسے ایک دوسرے کو بات کرنے کے لائق نہ سمجھ رہے ہوں۔

ب۔ پہلے آزادی تو مل جائے، پھر سب ہوتا رہے گا اور پھر یہ ہندوستانی لوگ پہلے حکومت کرنا بھی تو سیکھ لیں۔

ج۔ خوشیوں کا کوئی پیمانہ اُس وقت چھمی کی مسرّت کو ناپ نہیں سکتا تھا۔

۵۔ ماحول اور حالات انسانی رویّوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس بات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے چھمی کے کردار پر بحث کریں۔

۶۔ درج ذیل عبارت کی تلخیص کریں، جو اصل عبارت کی ایک تہائی سے زیادہ نہ ہو۔

موجودہ دور میں یوں تو ہزارہا مسائل ایسے ہیں جن کا تسلی بخش اور کسی قدر کارآمد حل تلاش نہیں کیا جا سکا لیکن دو مسائل ایسے ہیں جو دنیا بھر کے سائنس دانوں کی توجہ کا خاص مرکز بنے ہوئے ہیں، پہلا مسئلہ، خلائی تحقیق اور دوسرے سیاروں تک پہنچنے کی کوشش ہے۔ انسان جاننا چاہتا ہے کہ ہماری اس زمین سے پرے کون کون سی دنیائیں آباد یا غیر آباد ہیں اور اگر ضرورت پڑے تو انسان زمین کو چھوڑ کر کس دنیا میں آسانی سے پناہ لے سکتا ہے۔ دوسرا مسئلہ قطعی داخلی نوعیت کا ہے، یعنی کرۂ ارض پر رہتے ہوئے ہم اپنے لیے کس قدر مزید آسانیاں بہم پہنچا سکتے ہیں۔ دنیا سے بھوک، جہالت، افلاس اور امراض کا خاتمہ کرنے کے لیے ابھی ہمیں کن کن مراحل سے گزرنا ہے اور وہ کون سے طریقے ہیں، جن کی مدد سے بنی نوع انسان خوشگوار، محفوظ اور آرام دہ زندگی گزار سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کرۂ ارض کا داخلی مسئلہ خارجی مسئلے کی نسبت کہیں زیادہ مشکل اور اہم ہے۔ چاند یا مشتری پر کوئی سٹیشن قائم کرنا آسان ہے لیکن دنیا سے افلاس، جہالت اور امراض کا خاتمہ کرنا سخت مشکل، دشوار اور پریشانی کا باعث ہے۔

ہدایت برائے اساتذہ: طلبہ کو تلخیص کا مفہوم بتائیں اور تلخیص کی مشق کروائیں۔

آغا حشر کاشمیری

پیدائش: ۱۸۷۹ء | وفات: ۱۹۳۵ء

آغا حشر بنارس میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک مشہور و معروف کشمیری خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ابتدائی تعلیم حافظ عبدالصمد کے مدرسے میں ہوئی۔ مدرسے سے فارغ ہونے کے بعد جے نارائن سکول میں داخل ہوئے، وہیں سے اُنھوں نے شاعری کا آغاز کیا۔ وہ بنیادی طور پر شاعر تھے۔ زمانۂ طالب علمی میں احسن لکھنوی کے ایک ڈرامے سے اتنے متاثر ہوئے کہ ڈرامہ نگاری کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا اور کم عمری ہی میں شہرت حاصل کر لی۔ سکول ہی کے زمانے میں اُنھوں نے ''آفتابِ محبت'' نامی ڈرامہ لکھا۔ ڈرامہ نگاری کے شوق میں بمبئی چلے گئے اور یوں تعلیمی سلسلہ ختم ہوگیا۔

اُن کا پہلا مقبول ڈرامہ ''مریدِ شک'' تھا۔ اُنھوں نے اُردو ڈراموں میں ایک نئی جہت پیدا کی اور سٹیج ڈراموں کو بازاری پن اور عامیانہ ماحول سے نکال کر خالص ادبی صنف بنایا۔ آغا حشر کو زبان پر عبور حاصل تھا۔ وہ شاعرانہ تخیل کو سیدھے سادے الفاظ اور عام بول چال میں بیان کرتے۔ آغا حشر کی بدیہہ گوئی بہت مشہور ہے۔ وہ اتنی جلدی اشعار کہتے تھے کہ سننے والوں کو حیرت ہوتی۔ اُن کے ڈراموں کی کامیابی میں اُن کا شاعرانہ اسلوب بھی کارفرما ہے۔ ان میں مکالمہ نگاری کی استعداد بہت تھی۔ اُن کے مکالموں میں مبالغے کا انداز ہے، لیکن ان کے اثر سے انکار ممکن نہیں۔

تصانیف: رستم و سہراب، سفید خون، یہودی کی لڑکی، خوابِ ہستی، اسیرِ حرص اور خوب صورت بلا، نیک پروین، پاک دامن وغیرہ

خوب صورت بلا

کردار:

نیکی ، بدی ، شمسہ ، توفیق ، قتلو خان ، طغرل بیگ۔

شمسہ: ملکہ، جس نے سازش کر کے اپنے بھائی بادشاہ برجیس کو قتل کیا اور خود حکومت سنبھال لی اور اب اپنے بھتیجے شہزادہ سہیل کو قتل کر کے اپنے بھائی کا نام و نشان مٹانا چاہتی ہے۔

قتلو خان اور طغرل بیگ: شمسہ کے وفادار اور معتمد

توفیق: مقتول بادشاہ برجیس کا وفادار، جو اپنی جان پر کھیل کر شہزادہ سہیل کی جان بچانا چاہتا ہے۔

(نیکی کا آنا)

نیکی: خداوند کا جلال ہو مقدس ہے وہ خدا جو آدم کے سرکش اور باغی بیٹوں کو ماں باپ کی طرح پیار کرتا ہے۔ مبارک ہے وہ انسان جو سچے دل سے اور پوری سچائی کے ساتھ اس کی اطاعت اختیار کرتا ہے۔ اے گمراہ ہستی! جو اندھی اور دیوانی بنی تباہی کے غار کی طرف دوڑی جا رہی ہے، آ روشنی کی طرف آ۔ خدائے رحیم تیری پکار پر کان لگائے ہے۔ اُس کی رحمت تجھے گود لینے کے لیے محبت کے بازو پھیلائے ہے۔

ے جس راہ میں ہوں ٹھوکریں، وہ راہ اے انساں نہ چل
جرم وگنہ کے بوجھ سے ورنہ گرے گا منہ کے بل
تاریکیاں ہیں ہر طرف، اندھا نہ بن، اب بھی سنبھل
ایمان کا فانوس لے اور اُس میں جلا شمعِ عمل

ے اٹھ بھاگ، دوڑ، آ اس طرف، طاقت ابھی ہے پاؤں میں
آرام و راحت، زندگی، سب ہیں خدا کی چھاؤں میں

بدی: (آ کر) میں ہوں جہان کی خوشی، میں ہوں۔

نیکی: دُنیا کی مصیبت، خُدا اور انسان کے بیچ دیوار۔

بدی: دنیا کی قسمت میرے داہنے ہاتھ میں ہے اور اِس کی کنجی میرے بائیں ہاتھ میں ہے۔ تُم جو بہشت کی اُمید میں دنیا کو دوزخ بنائے ہوئے ہو، میری طرف آؤ اور میرا دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ میری سخاوت کے بادل موتی برسائیں گے اور تمہارے دامن کو بھی مالا مال کر دیں گے۔

نیکی: تُو جھوٹی ہے۔ تُو آدمی کو ذِلت، مصیبت اور خوفناک موت کے سِوا کچھ نہیں دے سکتی۔

بدی: چُپ! تُو ہی میری طرف آنے والوں کو روکتی ہے۔

نیکی: اور تُو نیک راہ چلنے والوں کو جہنم کے اندھیرے غار میں گراتی ہے۔

بدی: تُو نہ ہوتی تو دنیا میں بہشت کا مزہ آتا۔

نیکی: بدی! تُو نہ ہوتی تو خدا جہنم کو پیدا ہی نہ کرتا۔

بدی: نیکی! لڑائی چھوڑ

نیکی: بدی! بڑائی چھوڑ

بدی: اری! دنیا عاشقوں کا بازار ہے۔ اس میں کوئی تیرا خریدار ہے کوئی میرا طلب گار ہے۔

نیکی:
ے اگر نفرت ہے میرے عاشقوں کو تیری صورت سے
تو مجھ سے کس لیے لڑتی ہے، جا لڑ اپنی قسمت سے

ے جو آج جانتے ہیں دنیا کی حور تجھ کو
دے بیٹھے ہیں جو دل سے عقل و شعور تجھ کو

ے جس روز روشنی میں دیکھیں گے شکل تیری
نفرت کی ٹھوکروں سے پھینکیں گے دور تجھ کو

بدی: نادان! کبھی ایسا نہیں ہوگا۔ کیا تو نہیں جانتی کہ دنیا کی مٹی خود غرضی اور لالچ کے پانی سے گوندھی گئی ہے۔

نیکی: جھوٹی! تیرا ہر لفظ عداوت سے بھرا ہے۔ دنیا کا چمن بس میری ہی کوشش سے ہرا ہے۔

بدی: بس کر قیل و قال۔ اب دیکھ میرے عاشقوں کا حال۔

(طغرل کا شراب پیتے دکھائی دینا، ساتھیوں کا گانا)

گانا: اے پیارے مہاراجا۔ دُلارے مہاراجا۔ پیالے مے کے پی لو جی
پیو جانی، پیالے مے کے پی لو جی۔ اے پیارے-------

دوسرا: ے بہار آئی ہے بھر دے بادۂ گلگوں سے پیمانہ
رہے لاکھوں برس ساقی ترا آباد مے خانہ

بدی: میرے عاشقوں کا حال دیکھ چکی۔ اب اپنے چاہنے والوں کی ذلت اور مصیبت دیکھ۔

نیکی: بدی ہوئی شرط! دیکھنا میں ہارتی ہوں یا تو ہارتی ہے۔ (جانا)

(پردہ ہٹتا ہے اور شمسہ کا عالی شان مکان نظر آنا۔ سب درباریوں کا دست بستہ دکھائی دینا)

پہلا چوبدار: ع جلال ہمراہ، کمال ہمدم، عروج مانندِ چھتر سر پر

دوسرا: ع زمانہ حامی، فلک محافظ، سپہر بندہ، ستارہ چاکر

پہلا: ع نصیب درباں، قضا نگس راں، قدر ثنا خواں، ہو بخت یاور

دوسرا: ع سحاب قلزم، قدم قدم پر، زر و جواہر نثار سر پر

پہلا: ع وقار ہر سمت چھا رہا ہے، دلوں کی عظمت بڑھا رہا ہے

دوسرا: ع حضور تشریف لا رہی ہیں، کھڑے ہوں خدام سر جھکا کر

گانا: رہیں حکم سے تخت و تاج، ملک و راج، مال و منال۔ بلند نام ہو

دن بدن عزت بڑھے جاہ وجلال زمیں پہ آج ہے جس طرح آسمان محیط
یونہی جہان پہ چھایا رہے تیرا اقبال۔ رہیں-------------

(سہیلیوں کا ناچتے اور گاتے ہوئے اندر جانا)

شمسہ: جاؤ! اُس ضدی کو میرے سامنے لاؤ، ضد کس سے؟ مجھ سے جو طوفانی سمندر کی طرح غصے میں دیوانی ہو جاتی ہے، جو دم کے دم میں آندھی کی طرح بلائے ناگہانی ہو جاتی ہے۔ اگر یہ راہ پر نہ آیا، تو پھر اس کو دنیا میں جینے کا کوئی حق نہیں۔

(قلو کا توفیق کو پابہ زنجیر سامنے لانا)

شمسہ: کیوں توفیق کس حال میں ہے!

توفیق: کس حال میں ہے؟ شیر لوہے کے جال میں ہے۔

شمسہ: سرکش!

کیوں تباہی لا رہا ہے اپنے عزّو جاہ پر
چھوڑ دے گمراہی آ جا اب بھی سیدھی راہ پر

توفیق: دُنیا میں سچی اور سیدھی راہ فقط نیکی ہے جو قبر کے دروازے سے نکال کر قیامت کے میدان سے ہوتی ہوئی بہشت کے دربار میں پہنچاتی ہے۔ باقی ہر ایک راہ ٹھوکر کھلاتی ہے، کانٹوں میں پھنساتی ہے اور آخرکار جہنم کے اندھیرے غار میں گراتی ہے۔

پروا نہیں جو آج زمانہ خلاف ہے
رستہ وہی چلوں گا، جو سیدھا و صاف ہے
دکھ اور سکھ تو ہیچ ہیں میری نگاہ میں
میں جان بھی جو دوں گا، تو نیکی کی راہ میں

شمسہ: میں نہیں سمجھتی، نیکی کیا چیز ہے؟ جو تجھ کو اور تیرے جیسے چند بے وقوفوں کو عزیز ہے۔

توفیق: نیکی کیا چیز ہے؟ نیکی ایک پاک نور ہے، نیکی خدا کے ہاتھ کا بنایا ہوا ایک قلعہ ہے جس میں پاک انسان بیٹھ کر شیطان کی فوج کا مقابلہ کرتا ہے۔

شمسہ: پاگل ہو گیا ہے۔

توفیق: ہاں ہاں! میں پاگل ہو گیا ہوں مگر خدا کا شکر ہے، خدا کا باغی، حرص کا بندہ، شیطان کا غلام، بے رحم، خونی اور نمک حرام نہیں ہوں۔

شمسہ: او نمک حرام! ہمارے سامنے یہ گستاخانہ کلام؟

توفیق: میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو پیٹھ پیچھے برائی کا اظہار کرتے ہیں۔ میں بہادر ہوں اور بہادر ہمیشہ سامنے آکر وار کرتے ہیں۔

صاف دل اس طرح کہتے ہیں برابر صاف صاف
جس طرح آئینہ کہہ دیتا ہے منہ پر صاف صاف

قلو: اگر تُو ضد چھوڑ دے تو میں ایمان سے کہتا ہوں--------

توفیق: چپ بدمعاش! اس مقدس چیز کا نام نہ لے جس کا ایک ذرہ بھی تیرے ناپاک تن میں نہیں ہے۔ تم دونوں شیطان سے زیادہ ایمان کے دشمن ہو۔

شمسہ: بے شک ہیں اور اس لیے ہیں کہ بہادر کو نامراد اور سرخ کو زرد بنانے والا یہی ہے۔

توفیق: جس طرح خدا نے جسم کے لیے جان کا لیمپ جلایا ہے، اسی طرح جان کے لیے ایمان کا چراغ بنایا ہے۔

شمسہ: مگر میں ہوں، تو ضرور اس چراغ کی روشنی بجھاؤں گی۔

توفیق: اری! تو کیا، اگر تمام دنیا کے شیطان مل کر کوشش کریں پھر بھی یہ خدائی چراغ ہمیشہ جگمگاتا رہے گا اور جہاں میں رحم اور انصاف کی روشنی پھیلاتا رہے گا۔

شمسہ: توفیق! تو جانتا ہے میں کیسی عورت ہوں؟

توفیق: ذلت کی پتلی! تجھے عورت کون کہتا ہے؟ عورت وہ ہے جس میں رحم ہو، شرم ہو، سچائی ہو، باوفائی ہو،

پارسائی ہو، جس نے فرشتوں کی طینت اور حور کی عصمت پائی ہو۔ تُو کبھی عورت نہیں ہو سکتی۔ جس طرح تُو نے معصوم شہزادے کا دغا سے حق چھینا ہے، اسی طرح عورت کے نام پر بھی زبردستی قبضہ کر لیا ہے۔

شمسہ: توفیق! سُن

سانس سے آگ جو برساؤں وہ اژدر ہوں میں
ضد میں طوفان، تو غصے میں سمندر ہوں میں
پیس ڈالوں گی، مٹا دوں گی، فنا کر دوں گی
یاد رکھنا! تری تقدیر کا چکر ہوں میں

توفیق:

دل کا جوش ایسے ڈراوے سے کہیں گھٹتا ہے موم سے پنجۂ فولاد کہیں دبتا ہے
مت سمجھ دل سے مرے زہر دغا نکلے گا چیر کر دیکھ شرافت سے بھرا نکلے گا

رُوئیں رُوئیں کی زباں پر یہ سخن جاری ہے
جان پیاری نہیں، دنیا سے وفا پیاری ہے

قتلو: دیوانے! کیوں جان کر دنیا کی خوشیوں سے بے زار ہے۔ تیری ایک ہاں پر شاہی مہربانیوں کا بادل عزت، دولت اور رحم کی بارش برسانے کے لیے تیار ہے۔

توفیق: مجھے کوئی ایسی مہربانی نہیں چاہیے۔ او حرص کے غلام! یاد رکھ یہ کلام

چار دن ہے شان و شوکت کا خُمار موت کی تُرشی نشہ دے گی اُتار
جب اُٹھائیں گے جنازہ مل کے یار ہاتھ مَل مَل کے کہے گا بار بار

کس لیے آئے تھے ہم کیا کر چلے
جو یہاں پایا یہیں سب دھر چلے

شمسہ: بس بس یہ وعظ پاگلوں کے لیے رکھ چھوڑ، سہیل کو ہمارے حوالے کر۔ تاج کا تابعدار ہو، ورنہ خوفناک

انجام کی پیشوائی کے لیے تیار ہو۔

توفیق: کیا معصوم شہزادے کو تم قصابوں کے پنجے میں ذبح ہونے کے لیے دے دوں؟ رحم اور انصاف کے گلے پر چھری پھیر دوں؟ تخت و تاج کے لٹیروں کو تعظیم کروں؟ شیطان کو بہشت کا مالک و وارث تسلیم کروں؟ نہیں! وفادار توفیق سے ایسا کبھی نہیں ہو گا۔

قتلو: مگر تم کو ایسا ضرور کرنا پڑے گا۔

توفیق: کیوں؟

شمسہ: ہمارا حکم

توفیق: تیرا حکم کوئی خدا کا حکم نہیں ہے۔

شمسہ: میں شاہی حکم دیتی ہوں۔

توفیق: میں تیری شاہی سے بھی منکر ہوں۔

تیر و تلوار و تبر نیزہ و خنجر برسیں زہر، خوں، آگ، مصیبت کے سمندر برسیں
بجلیاں چرخ سے اور کوہ سے پتھر برسیں ساری دنیا کی بلائیں مرے سر پہ برسیں

ختم ہو جائے ہر اک رنج و مصیبت مجھ پر
گر ایمان کو جنبش ہو، تو لعنت مجھ پر

شمسہ: غور کر پھر غور کر ورنہ اجل تیار ہے تیرا سر ہے اور اس جلاد کی تلوار ہے

توفیق: مصیبت کے ڈر، رنج کے ہول سے بہادر بدلتے نہیں قول سے
خدا لے کہ تُو لے، یہ جاں ایک ہے مگر بات ایک اور زباں ایک ہے

شمسہ: مجھ پہ لعنت ہے جو تجھ کو اب میں زندہ چھوڑ دوں کاٹ لا سر، تا کہ اس کو ٹھوکروں سے پھوڑ دوں

(جانا) سین ختم

مشق

۱۔ ڈرامے کی تعریف کریں اور آغا حشر کاشمیری کے چند دیگر ڈراموں کے نام لکھیں۔

۲۔ بدی نے اپنی تعریف میں جو کچھ کہا، اسے اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

۳۔ شمہ نے توفیق سے کیا مطالبہ کیا؟

۴۔ مقفیٰ نثر کسے کہتے ہیں۔ اِس سبق میں سے مقفیٰ نثر کی کم از کم پانچ مثالیں لکھیں۔

۵۔ توفیق نے عورت کی تعریف کن جملوں میں کی ہے؟

۶۔ درج ذیل الفاظ کے معنی لکھیے۔

سرکش، عداوت، قیل وقال، چھتر، پابہ زنجیر، طینت، اژدر، جُنبش، چرخ، سحاب، تبر۔

۷۔ توفیق کے کردار کے بارے میں چند سطریں لکھیں۔

۸۔ ''شیر ہوتے ہے جال میں ہے'' یہاں شیر بہادر آدمی کے لیے استعارہ ہے۔ استعارے کی تعریف کریں اور مثالیں دیں۔

۹۔ اپنے معاشرے اور ماحول کے حوالے سے قلو کے کردار کا تنقیدی جائزہ پیش کریں۔

۱۰۔ جب کسی جملے میں دو افعال اکٹھے استعمال ہوں، ان میں ہر دوسرا فعل امدادی فعل کہلاتا ہے۔ امدادی فعل کے استعمال سے جملہ مؤثر اور واضح ہو جاتا ہے۔ جیسے: آجانا، کھالیا، دے دیا، مار ڈالا، سوگیا وغیرہ۔ کوئی سے پانچ جملے لکھ کر ان میں امدادی فعل کی نشاندہی کریں۔

سرگرمی اساتذہ طلبہ سے اس ڈرامے کے مکالموں کی درست تلفظ کے ساتھ بلند خوانی کروائیں۔

ہدایت برائے اساتذہ: طلبہ کو استعارے کی تعریف مع ارکان، مثالوں کے ذریعے بتائی جائے۔

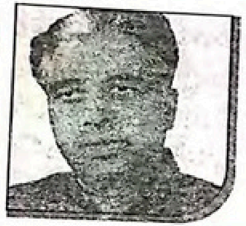

خواجہ معین الدین

پیدائش: ۱۹۲۴ء

وفات: ۱۹۷۱ء

خواجہ معین الدین حیدر آباد (دکن) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حیدر آباد دکن میں حاصل کی۔ ۱۹۴۹ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔ سندھ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کرنے کے بعد درس وتدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ انھوں نے انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں بڑی مشقت کے بعد بچوں کے لیے ایک تعلیمی اِدارے کی بنیاد رکھی۔ سکول کے قیام کے لیے چندہ مہم میں انھوں نے ایک ڈراما ''زوالِ حیدر آباد'' سٹیج کیا اور اس کی ساری آمدنی سکول کے لیے وقف کر دی۔ یہیں سے خواجہ معین الدین اور اُردو ڈراما لازم وملزوم ہو گئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد اردو ڈرامے اور تھیٹر میں ان کا نام بہت نمایاں ہے۔ ان کے ڈراموں میں سماجی طنز، تہذیبی روایات اور تبدیل ہوتے اقدار کی واضح جھلک موجود ہے۔

تصانیف: لال قلعے سے لالو کھیت تک، مرزا غالب بندر روڈ پر اور تعلیمِ بالغاں وغیرہ۔

Not For Sale

خواجہ معین الدین

تعلیمِ بالغاں

(ایک ایکٹ کا طنزیہ و مزاحیہ کھیل)

کردار جس ترتیب سے اسٹیج پر آتے ہیں۔

☆۔ مولوی صاحب ☆۔ قصاب

☆۔ حَجام ☆۔ وکٹوریہ والا

☆۔ مولوی صاحب کی بیوی (پسِ پردہ)

مقام: بکرا پیڑھی کراچی کی ایک کچی بستی

سیٹ: ایک جھونپڑی

زمانہ: ۱۹۵۴ء

وقت: صبح

منظر

ایک شکستہ سی جھونپڑی جس کے دائیں جانب ایک ٹاٹ کا پردہ پڑا ہے جو اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اندر کی جانب جھونپڑی کا زنانہ حصہ ہے۔ پردے کے قریب ہی ایک گھڑونچی رکھی ہے، جس پر تین گھڑے رکھے ہیں۔ دو ٹوٹے ہوئے اور ایک ثابت.......... ثابت گھڑے پر چاک سے ''یقین محکم'' لکھا ہے۔ دوسرا گھڑا پیندے اور گلے کی جانب سے ٹوٹا ہوا ہے جس پر ''تنظیم'' لکھا ہے اور تیسرا گھڑا ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے اور ایک ٹوٹے ہوئے ٹکڑے پر ''اتحاد'' لکھا ہے۔ جھونپڑی کے درمیان میں مدرسے کے اُستاد محبت علی کی چارپائی پڑی ہے۔ جھونپڑی

کے بائیں جانب ایک تختۂ سیاہ (بلیک بورڈ) اسٹینڈ پر رکھا ہے، جس پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:

''مدرسۂ تعلیمِ بالغاں۔ بکرا پیڑھی، میوہ شاہ لائن، کراچی، حکومتِ اسلامی، پاکستان۔

صدر مدرس محبت علی۔''

پردہ اُٹھتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ اُستاد محبت علی چارپائی پر بیٹھے ہیں اور ایک ازار بند بُن رہے ہیں۔ دائیں جانب قصائی اپنا کندہ اور چھرے لیے بیٹھا ہے۔ پسِ منظر سے ایک آواز یہ شعر پڑھتی ہے:

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

(آخری مصرع پر قصائی اپنے چُھرے ایک دوسرے پر رگڑ کر تیز کرتا ہے۔)

شمشو حَجام: (باہر سے آواز آتی ہے) مولی صاب، مولی صاب۔

مولوی: (دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے) ارے کون؟

حَجام: (اندر آتے ہوئے) میں ہوں مولی صاحب۔ آپ کا شاگرد شمشیر علی عرف شمشو۔ (حَجام اندر آتا ہے، جس کے ہاتھ میں ایک ٹین کا بستہ نما ڈبہ ہے جس پر اس کا نام اس طرح لکھا ہے: ''شم شیر علی'')

مولوی: (پیار سے اسے گلے لگاتے ہوئے) ارے شمشو! تو آ گیا بیٹے۔ شمشو بیٹے تو نے کہا تھا کہ جمعے کے دن میرے پاس بہت گاہک ہوتے ہیں۔ ہفتے کو بچے کے بال کاٹ دوں گا۔ کاٹ دیے بیٹے۔

حَجام: (فخریہ انداز میں) کاٹ دیا ہوں مولی صاحب۔ انگریزی بال کاٹا ہوں۔

(مولوی صاحب قصائی کی پیٹھ پر ڈنڈا مارتے ہیں)

مولوی: چل بے دھندا بند کر اور وہ درخواست پڑھ کر سنا۔

قصاب: کون سی جی! وہ جو محکمہ تعلیم کو لکھوائی تھی؟

مولوی: (اسی غصے میں) ہاں وہی۔

(قصائی برابر رکھے ہوئے رجسٹر میں سے درخواست نکال کر پڑھنا شروع کرتا ہے۔)

قصاب: سات سو چھاسی بے بیانوے۔

مولوی: (ڈنڈا مار کر) ارے وہ تو بسم اللہ کی جگہ لکھا جاتا ہے نا کمبخت۔ آگے پڑھ۔

قصاب: (پڑھتے ہوئے) عالی جناب عزت مآب و فضیلت مآب و..........زیرِ تعلیم۔

مولوی: (گھبرا کر) ہائیں زیرِ تعلیم (ڈنڈا) زیرِ تعلیم (ڈنڈا) ارے! وہ وزیرِ تعلیم ہے نا۔ ہزار دفعہ پڑھا چکا ہوں، واؤ پر زور دے کر پڑھ۔ (سمجھاتے ہوئے) دیکھ! واؤ سے ووٹ ہے نا۔

(حجام اور قصائی توجہ سے سنتے ہوئے۔)

دونوں: ہے!

مولوی: ووٹ کا واؤ زیرِ تعلیم کے آگے لگا دیتے ہیں، تو زیرِ تعلیم، وزیرِ تعلیم بن جاتا ہے۔

حجام: (خوش ہو کر) واہ! کیا اللہ کی شان ہے مولوی صاحب۔

مولوی: (ڈنڈا اٹھاتے ہوئے) ہاں! بتاؤں اللہ کی شان۔

(حجام ڈر کر سمٹ جاتا ہے۔)

مولوی: چل! آگے پڑھ۔

قصاب: (پڑھتے ہوئے) وزیرِ تعلیم صاحب دام اقبالہ ہو ہو ہو۔

مولوی: (ڈنڈا مار کر) ہو ہو۔ ہو ہو۔ یہ ہو ہو ہا ہا ہی ہی کیا کر رہا ہے؟ اسے کوئی ریڈیو پاکستان سمجھ رہا ہے کہ جہاں اقبالؔ کا نام آیا، شروع ہو گئی قوالی۔ آگے پڑھ۔

قصاب: (پڑھتے ہوئے) دام اقبالہٗ (مشکل سے ادا کرتا ہے) ہم جملہ خورد و کلاں یہاں خیریت سے رہ کر آپ کی خیریت درگاہِ خداوندی سے نیک مطلوب۔

مولوی: ہاں (ایک دم روک کر) نیک مطلوب کے آگے چاہتا ہوں بھی لکھ دے۔ یہ نہیں سمجھیں گے، تو یہ سمجھ جائیں گے۔

قصاب: (لکھتے ہوئے) نیک مطلوب چاہتا ہوں۔

مولوی: آگے پڑھ۔

قصاب: (پڑھتے ہوئے) دیگر کوائف یہ ہیں کہ مدرسے کا کام عمدگی سے چالو ہے۔

مولوی: (روک کر) ہاں۔ یہ جملہ بہت اہم ہے۔ اس کے اوپر انڈر لائن کر دے۔

قصاب: (حیران ہو کر) اُوپر انڈر لائن کروں؟

مولوی: (چڑ کر) اور نہیں تو کیا نیچے کرے گا؟

قصاب: (ڈر کر) اچھا اچھا۔ (لائن لگاتے ہوئے) اوپر انڈر لائن۔ مگر چھے ماہ سے تنخواہ نہ ملنے کے سبب مدرسے کو شاگردوں کا قرضہ ہو گیا ہے۔

(باہر سے خان صاحب کی آواز آتی ہے)

وکٹوریہ والا: (باہر سے آواز) مولی صاحب۔ خو مولی صاحب۔

مولوی: (دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے) ارے کون؟

قصاب: اجی آپ کا شاگرد چراغ شاہ پکار رہا ہے مولوی صاحب۔

مولوی: (خوش ہو کر) اچھا۔ چراغ شاہ نے میری شاگردی قبول کر لی؟ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ، ''بابا اگر وزیر بننا ہے تو کم سے کم دستخط کرنا سیکھ لو۔''

قصاب: لیکن مولوی صاحب۔ وہ تو کہتا تھا کہ اب کے میں ایک مُہر بنا لوں گا مُہر۔

مولوی: (بے نیازی سے) ہاں، حکومت کے کام تو مُہر سے بھی چل سکتے ہیں لیکن منتخب ہونے کے بعد دوسروں کی لکھی ہوئی تقریر کو خود پڑھنا پڑتا ہے۔ نہیں تو پبلک پہچان کر نعرے لگا دیتی ہے۔

وکٹوریہ والا: (زور سے آواز دیتا ہے) مولی صاب۔ خو مولی صاب۔

مولوی: (چڑ کر) ارے کون کمبخت ہے یہ؟

قصاب: ارے اپنا چراغ شاہ مولوی صاحب۔ چغو (حَجام اور قصائی آواز دیتے ہیں)

حَجام اور قصاب: ارے آ جا چغو۔ کیا باہر کھڑا مولی صاحب مولی صاحب کر رہا ہے۔

(خان صاحب وکٹوریہ والا) دائیں جانب کے ونگ سے داخل ہوتا ہے بنیان اور شلوار پہنے ہوئے ہے۔ ہاتھ میں چچی ہے۔ اندر داخل ہوتے ہی دو بار چچی ہوا میں جھاڑتا ہے۔ چچی سے چٹاخ چٹاخ کی آوازیں نکلتی ہیں)

(حجام اور قصائی ڈر کر مولوی صاحب کے پیچھے آجاتے ہیں مولوی صاحب بھی خوفزدہ ہو کر اپنے پیر چارپائی کے اوپر کر لیتے ہیں)

مولوی: (ڈرتے ڈرتے) ک......... کیا......... بات ہے چھو بیٹے۔ آج اتنے دنوں کے بعد مدرسے آئے ہو اور وہ بھی بغیر کرتوں کے اور یہ ہاتھ میں چچی کیوں ہے بیٹے؟

وکٹوریہ والا: (غصے میں چچی جھاڑ کر) خو چچی نہیں ہوگا تو کیا ہوگا۔ پیسہ لے کے بیس دن ہوگیا۔ دینے کا نام نہیں لیتا۔ خو چچی نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا؟

حجام: مولوی صاحب۔ یہ چچی ہوتی بہت بُری چیز ہے۔ اس سے تو بڑے بڑے شیر بھی سیدھے ہوجاتے ہیں۔

مولوی: (حجام کو ڈانٹ مارتے ہوئے) ارے چپ رہ کمبخت (خان صاحب سے) ارے چھو۔ میں نے تجھ سے بیس روپے ادھار لیے تھے۔ دس روپے تو واپس کر چکا ہوں (گواہی کے طور پر حجام اور قصائی کو دیکھتے ہیں)

حجام اور قصاب: (گواہی دیتے ہوئے) ہاں ہاں ہمارے سامنے دیئے ہیں۔

وکٹوریہ والا: (چچی جھاڑ کر) خو باقی دس کا کیا ہوگا۔

حجام: (مولوی سے) ہاں باقی دس کا کیا ہوگا۔ جواب دو۔

مولوی: ارے چھو۔ جب حکومت نے ہماری گرانٹ آدھی کر دی ہے تو میں تیرے پورے پیسے کیسے دے سکتا ہوں۔

(وکٹوریہ والا زمین پر بیٹھتا ہے کہ یکا یک اندر سے مولوی صاحب کی بیوی کی آواز آتی ہے)

بیوی: (اندر سے) ـــ سب۔ یہ گھوڑا کس کا ہے، جگی کی جگی کھائے جا رہا ہے۔

مولوی: (چونک کر) ارے رے رے۔ ارے وکٹوریہ کہاں چھوڑا۔ تیرا گھوڑا میری جگی کھا رہا ہے۔

(دو ڈنڈے رسید کرتا ہے) بھاگ۔ ارے بھاگ۔

(وکٹوریہ والا ڈنڈے کھا کر باہر بھاگتا ہے۔ قصائی اور حجام ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوجاتے ہیں۔

قصاب: (ہنستے ہوئے) مان گئے مولی صاحب مان گئے آپ کو۔

حجام: (ہنستے ہوئے) مان گئے ایمان سے۔

مولوی: (خود بھی خوش ہوتے ہوئے) کیا بات ہے! کیا بات ہے! میں نے کوئی کارنامہ کیا ہے؟

قصاب: (ہنستے ہوئے) اجی بہت بڑا کارنامہ۔

مولوی: (خوش ہو کر) اجی سنتی ہو (بیوی کو آواز دیتے ہیں) میں نے ایک کارنامہ کیا ہے (حجام اور قصائی سے) ذرا زور سے بولو بچے کا ماموں بھی آیا ہوا ہے۔

قصاب: (ہنستے ہوئے) اجی قرض خواہ کو بھگانے کی ترکیب تو کچھ آپ ہی کو آتی ہے۔

مولوی: (غصے میں دونوں کو ایک ایک ڈنڈا رسید کرتے ہوئے) چپ۔ چپ۔ کم بختوں نے قرض لینا بھی مشکل کر دیا۔ ارے بابا میں ایک غریب آدمی ہوں۔ میں نے قرض لیا تو کیا ہوا۔ آج کل تو بڑی بڑی حکومتیں قرض لیتی ہیں۔

قصاب: (توجہ ہٹانے کے لیے خود بخود درخواست پڑھنے لگتا ہے) چھ ماہ سے تنخواہ نہ ملنے کے سبب مدرسے کے شاگردوں کا قرضہ ہوگیا ہے۔

مولوی: (غمگین ہو کر اپنے آپ سے) اور اب تو یہ حالت ہوگئی ہے کہ شاگرد استاد کو قینچی دکھانے لگے ہیں

قصاب: (لکھتے ہوئے دہراتا ہے) قینچی دکھانے لگے ہیں۔

مولوی: (چونک کر) ارے کاٹ۔ کاٹ۔

(حجام جو قینچی سے اپنی مونچھیں ٹھیک کر رہا ہے گھبرا کر وہ الفاظ جو مولوی صاحب بن رہے تھے ق... سے کاٹ دیتا ہے)

مولوی: (تڑپ کر) ہے ہے ہے۔ ارے جملہ کاٹنے کو کہا تھا، ازار بند کاٹ دیا۔ دن بھر کی محنت اور چھ آنے کا ستیاناس کر دیا۔

(مولوی صاحب ڈنڈا اٹھا کر حجام کو مارنا چاہتے ہیں وہ قینچی پیٹ کی طرف کر دیتا ہے۔ پلٹ کر قصاب کو مارنا چاہتے ہیں وہ چُھرا اُٹھالیتا ہے۔ مولوی صاحب ڈر کر ڈنڈا رکھ دیتے ہیں اور پیار سے کہتے ہیں)

مولوی: (حجام سے) رکھ دو بیٹا۔ رکھ دو۔ یہ تیز ہتھیار ہیں نا۔ ان کا کھیل اچھا نہیں ہوتا بیٹے۔ رکھ دو۔ شاباش۔

(حجام مولوی صاحب کے نرم رویہ کو دیکھ کر قینچی نیچے رکھ دیتا ہے)

مولوی: (قصاب سے) دیکھ خلیفہ نے ہتھیار رکھ دیئے ہیں تم بھی رکھ دو۔ یہ تیز ہتھیار ہیں نا بیٹے ہاتھ واتھ کٹ جائے گا۔ خون نکل آئے گا نا۔ رکھ دو۔ شاباش۔ (قصاب، حجام کی دیکھا دیکھی خود بھی چھرا کندے پر رکھ دیتا ہے)

مولوی: (قصاب کے دو ڈنڈے زوردار لگاتے ہیں) رکھ رکھ۔ کمبخت کہیں کے۔ کوئی قینچی دکھا رہا ہے۔ کوئی چھرا دکھا رہا ہے۔ کوئی قینچی دکھا رہا ہے۔ مدرسہ تعلیم بالغاں کیا ہوا اچھی خاصی ایسٹ پاکستان کی اسمبلی بنا رہے ہیں۔

(قصاب دو ڈنڈوں کی ضرب سے غصے میں آجاتا ہے)

مولوی: چل آگے پڑھ۔

قصاب: (غصے میں) شاگردوں کا قرضہ ہوگیا ہے۔ بس یہیں تک لکھائے تھے۔

مولوی: تو آگے لکھ۔

قصاب: (غصے میں) بولیے۔

مولوی: (لکھاتے ہوئے) جناب والا۔

قصاب: (غصے میں جیسے ڈانٹ رہا ہو) جناب والا۔

(مولوی صاحب ڈنڈا اٹھانا چاہتے ہیں قصاب تیزی سے خود ڈنڈا اُٹھالیتا ہے)

مولوی: (بے بسی سے ڈنڈے کو دیکھتے ہوئے) ارے عاجزی سے لکھو بیٹا۔ عاجزی سے لکھو۔ مجھے چھ مہینے سے تنخواہ نہیں ملی نا۔ (پیار سے) عاجزی سے لکھو بیٹا۔

(قصاب، مولوی صاحب کے رویہ سے نرم پڑ کر ڈنڈا رکھ دیتا ہے)

مولوی: (ڈنڈا اُٹھا کر) عاجزی سے لکھ (ڈنڈا) سے لکھ (دوسرا ڈنڈا)

(قصاب تڑپ کر رونے لگتا ہے)

مولوی: جناب والا

قصاب: (ہچکیاں لیتے ہوئے)............جنا............ب............والا۔

مولوی: ارے رو رہا ہے کیوں؟

قصاب: عاجزی سے لکھ رہا ہوں نا مولوی صاحب۔ عاجزی سے لکھ رہا ہوں۔

مولوی: تیری عاجزی کے قربان۔ پڑھنے والوں کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ لکھو۔ جناب والا۔

قصاب: (لکھتے ہوئے) جناب والا۔

(مولوی صاحب لکھواتے ہیں۔ قصاب دہراتا جاتا ہے)

مولوی: گزشتہ سال............حکومت کے رحم و کرم سے............از راہ مرحمت۔

قصاب: (لکھتے ہوئے) از راہ مرمت۔

مولوی: مرمت نہیں۔ مرحمت۔ مرحمت ("ح" کے مخرج کو واضح کرتے ہوئے)

حجام: (قصائی کو سمجھاتے ہوئے) مرخمت۔ مرخمت (اپنے گلے کی طرف اشارہ کرتا ہے)

قصاب: (لکھتے ہوئے) از راہ مرحمت............

مولوی: (لکھاتے ہوئے) مدرسہ تعلیم بالغاں کے لیے............ایک دری............ایک چھڑی............

ایک بلاک بورڈ (بلیک بورڈ)..........ایک لکڑی کا صندوق......

(لکھتے ہوئے) ایک لکڑی کا صندوق۔

(جھک کر قصائی کی تحریر کو پڑھ کر) اوہو ہو ہو۔ قابلیت دیکھ رہے ہیں۔ صندوق صواد سے لکھ رہے ہیں صاحبزادے (ڈنڈا لہراتا ہے)

(بگڑ کر) صندوق صواد سے ہے مولوی صاحب۔

صواد سے ہے؟

صواد سے ہے۔

ارے وہ ساگوان کا ہے نا۔ میں بھی ہمیشہ سے یہی غلطی کرتا آیا تھا۔ خدا سلامت رکھے۔ ایک دن انسپکٹر آف سکول معائنے کے لیے تشریف لائے تو انہوں نے میری یہ غلطی درست کی۔

(حیران ہو کر) کونسی غلطی؟

یعنی کہ ساگوان کا صندوق "س" سے لکھنا چاہیے۔

(مضحکہ اڑاتے ہوئے) ہوں۔ ساگوان کا صندوق "س" سے اور شیشم کا ش..........

(جملہ پورا نہیں ہو پاتا کہ مولوی صاحب کا ڈنڈا پڑتا ہے)

کیوں؟ شیشم کا شین سے نہیں ہو سکتا؟ ارے جو انسپکٹر صاحب چاہے وہی ہو سکتا ہے سمجھا؟

(چوٹ پر تڑپ کر) ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے۔

(توجہ دلانے کے لیے لکھتے ہوئے) ایک لکڑی کا "س" سے صندوق..........

ونیز۔

انیس

ارے انیس نہیں بابا۔ و۔ نیز (پہلے صندوق کرتے ہیں پھر جبڑے پھیلا کر)

(نقل کرتے ہوئے) و..........نیز۔

ہاں شاباش، دیکھ حجام کو عقل ہے تیرے کو نہیں ہے۔

قصاب: (لکھتے ہوئے) ونیز۔

مولوی: (لکھاتے ہوئے) تین گھڑے..........مسمی اتحاد..........تنظیم..........اور یقین محکم عطا کیے گئے تھے...... (اٹھ کر گھڑوں کی طرف جاتے ہیں) سو مدرسے کے ناہنجار طالب علموں نے..........آپس میں لڑ جھگڑ کر..........اتحاد کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ (ٹوٹا ہوا گھڑا اُٹھا کر دکھاتے ہیں جس پر چاک سے "اتحاد" لکھا ہے)

قصاب: مولوی صاحب۔ یہ اتحاد کے ٹکڑے ٹکڑے کس نے کیے مولوی صاحب۔

مولوی: ہائیں۔ خود ہی توڑ کر پوچھ بھی رہا ہے۔ ارے تو گرو مندر کا تو نہیں ہے؟

قصاب: (فخر سے سینے پر ہاتھ مار کر) اجی میں تو بانس بریلی کا ہوں۔ بانس ریلی کا۔

مولوی: (چڑانے کے انداز میں نقل کرتے ہوئے) اجی میں تو بانس بریلی کا ہوں، بانس بریلی کا۔ کھاتے پاکستان کا۔ گاتے بانس بریلی کا۔ آج جس کو دیکھو کوئی سندھی ہے، کوئی پنجابی ہے۔ کوئی بلوچی ہے، کوئی پٹھان ہے۔ ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا رہا ہے اور لائق شاگرد پوچھ رہے ہیں کہ اتحاد کے ٹکڑے ٹکڑے کس نے کیئے مولوی صاحب؟ ارے ٹکڑے ٹکڑے تو تمہارے ہونے تھے کم بختو۔

قصاب: (شرمندہ ہو کر لکھنے لگتا ہے) اتحاد کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہیں۔

مولوی: (دوسرا گھڑا اٹھاتا ہے جس پر "تنظیم" لکھا ہے) تنظیم کا گلا غائب اور پیندے میں سوراخ ہو گیا ہے۔ (گھڑے کا گلا اور پیندا دکھاتے ہوئے)

(اس عرصے میں حجام بیڑی جلا کر پینے لگتا ہے)

حجام: (بیڑی پیتے ہوئے) خیر یہ اتحاد کے تو ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ پر یہ تنظیم کا گلا کس نے غائب کیا مولوی صاحب؟

مولوی: (بیڑی پیتے دیکھ کر) ہائیں۔ مدرسے میں بیٹھ کر بیڑی پی رہا ہے۔ بجھا بیڑی۔ بجھا (حجام بیڑی

والا ہاتھ پیچھے کر لیتا ہے اور پیٹھ مولوی صاحب کی طرف)

اوہو ہو۔ادب ہو رہا ہے۔مولوی صاحب سے بیڑی چھپا رہے ہیں۔(ہاتھ سے بیڑی چھین کر) آج شاگرد مدرسے میں بیٹھ کر بیڑی پیتے ہیں۔چپڑاسی افسروں سے ماچس مانگتے ہیں۔افسر رشوت لیتے ہیں۔لیڈر قوم کو دھوکا دیتے ہیں اور لائق شاگرد پوچھتے ہیں "یہ تنظیم کا گلا کس نے غائب کیا مولوی صاحب" ارے گلے تو تمہارے غائب ہونے تھے کم بختو۔

(لکھواتے ہوئے) لے دے کے..........ایک یقینِ محکم رہ گیا ہے..........جس پہ کام چالو ہے..........اگر..........اتحاد اور تنظیم سے..........اب بھی سبق نہ لیا گیا..........تو یہ قوم..........یقین محکم کا بھی..........وہی حشر کر دے گی۔

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیں۔

(ا) مولوی صاحب قرض کیوں واپس نہ کر سکے؟

(ب) مولوی صاحب نے اتحاد کے ٹکڑے ہونے کی کیا وجوہات بتائیں؟

(ج) مدرسہ تعلیم بالغاں کہاں واقع تھا؟

(د) اس اقتباس میں وزیروں پر کیا طنز کیا گیا ہے؟

(ہ) مولوی صاحب کس محکمہ کے نام درخواست لکھوا رہے تھے؟

۲۔ جملے بنائیں۔

سر پہ چڑھ جانا۔ رحم و کرم پر ہونا۔ ستیاناس کرنا۔ ازراہِ رحمت۔ آسمان سر پر اُٹھانا۔

۳۔ متن کے مطابق خالی جگہ پُر کریں۔

(ا) دیکھو.......... نے ہتھیار رکھ دیے ہیں، تم بھی رکھ دو۔

(ب) چپڑاسی.......... سے ماچس مانگتے ہیں۔

(ج) کوئی چھرا دکھا رہا ہے کوئی.......... دکھا رہا ہے۔

(د) ہے ہے ہے۔ارے! جملہ کاٹنے کو کہا تھا.......... کاٹ دیا۔

(ہ) مدرسے کو شاگردوں کا.......... ہو گیا ہے۔

۴۔ مکالمہ نگاری کی تعریف کیجیے نیز استاد اور شاگرد کے درمیان، بے ہنگم ٹریفک سے پیدا ہونے والے مسائل پر مکالمہ تحریر کریں۔

۵۔محاورے کی تعریف کریں اور کوئی سے پانچ محاورے لکھیں۔

انشائیہ:

انشائیہ ایک شخصی صنفِ ادب ہے۔انشائیہ نگار کی ذات کو اِس صنف میں مرکزیت حاصل ہوتی ہے۔انشائیہ نگار اپنی ذات کے حوالے سے شگفتہ اسلوب میں اشیا کے بارے میں اپنا فلسفیانہ نقطۂ نظر واضح کرتا جاتا ہے۔

یعنی "انشائیہ" ایک داخلی، ذاتی اور ایسی موضوعی (جس کا کوئی موضوع رعنوان ہوتا ہے) تحریر ہے جس کا اسلوب اور بیان کسی خارجی مقصد کا تابع (مطیع، فرمانبردار) نہیں بلکہ لکھنے والے کی شخصیت، اس کی زندگی کے مجموعی تصور اور انفرادی احساس کا اظہار ہے۔عام مضمون نویسی کے برعکس انشائیہ کا لہجہ، سادہ، بے تکلف اور گھریلو ہوتا ہے۔ایک مغربی نقاد کے مطابق:

"انشائیہ نگاری ذہنی آزاد خیالی کا نام ہے۔"

سرسید کے بعد انشائیہ لکھنے والوں میں حالؔی، شبلؔی، آزادؔ، شرؔر، سجاد حیدر یلدرم، نزیر احمد، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، مشکور حسین یاد اور وزیر آغا کے نام اہم ہیں۔

ہدایت برائے اساتذہ:	اس ڈرامے کو کلاس روم میں سٹیج کروانے کی کوشش کریں۔

ابنِ انشا

پیدائش: ۱۹۲۷ء

وفات: ۱۹۷۸ء

ابنِ انشا کا اصل نام شیر محمد خان تھا۔ وہ جالندھر میں پیدا ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد لاہور چلے آئے۔ ادبی زندگی کا آغاز بحیثیت شاعر کیا۔ بعد میں بطور مزاح نگار، افسانہ نویس، صحافی اور سفرنامہ نویس شہرت حاصل کی۔ مزاح کے میدان میں انھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور ہر طرح کے قاری سے داد وصول کی۔ ان کا اسلوبِ تحریر سادہ، رواں، دلکش اور شگفتہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں مزاح پیدا کرنا اُن کا خاصہ ہے۔ ہر موقع پر ہنسنے ہنسانے کی گنجائش پیدا کر لیتے ہیں۔ الفاظ کے صحیح انتخاب اور اُن کے درست استعمال پر انھیں قدرت حاصل ہے۔ چلتے ہو تو چین کو چلیے، دُنیا گول ہے، ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں، اور آوارہ گرد کی ڈائری میں ابنِ انشا ایک ایسے بنجارے کے روپ میں نظر آتے ہیں، جو گرد و پیش پر بیگانہ روی سے نظر ڈالتے ہیں، لیکن حقیقت میں اُن کی آنکھ اشیا کے باطن کو دیکھتی ہے اور قاری کو ماضی اور حال سے آشنا کرتی چلی جاتی ہے۔ وہ اپنے قاری کی دلچسپی کے لیے معلوماتی مواد اور تاریخی واقعات کو موثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اُن کی تحریروں میں طنزِ لطیف پایا جاتا ہے، جس سے بات میں عمق اور اثر آفرینی پیدا ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں بھولے بسرے اور متروک الفاظ کے استعمال سے منفرد دلکشی پیدا کی ہے۔

تصانیف: [illegible] آوارہ گرد کی ڈائری، دنیا گول ہے، ابنِ بطوطہ کے [illegible] میں وغیرہ۔

شیراز اور کنارِ آبِ رُکنا باد وغیرہ

ان لوگوں پر ہمیں رشک تو خیر کبھی نہیں آیا؛ تعجب ہمیشہ ہوا ہے، جو صبح اُٹھ بیٹھتے ہیں۔ چرند پرند کی اور بات ہے، انسانوں کا اتنے سویرے اٹھنا کبھی ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں لحاف کے اندر جو مزے کی غنودگی ہوتی ہے، اس کا لطف صبح اٹھنے والے بے نصیب کیا جانیں۔ وہ تو اس وقت جنگل میں داتنیں کاٹ رہے ہوتے ہیں یا ٹھر ٹھر کرتے لارنس باغ کے چکر۔ صبح اٹھنے کے فضائل ہم نے بھی پڑھے ہیں لیکن صبح خیزوں میں سے کچھ کو تو نمونیے یا بگڑے زکام سے مرتے دیکھا، باقی کی عمریں بھی ہماری چال کے سست الوجودوں سے زیادہ لمبی ہوتی نہیں دیکھیں۔

پس ہم نے رات ہی کو ہوٹل کے نوکروں کو وصیت کر دی کہ بھائی صبح پانچ بجے جگا دینا، ہم شیراز جائیں گے۔ سبھی نے ''چشم'' کہہ کر سینے پر ہاتھ رکھے اور واقعی سب کے سب علی الصبح ہمارے دروازے کے سامنے صف بستہ کھڑے تھے۔ کھڑکی سے باہر دیکھا تو ابھی کالی رات تھی حتیٰ کہ مرغ بھی جن کو بانگ دینے کے لیے اُٹھنا چاہیے تھا، خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ لمبی سی آہ بھر کر اُٹھے۔

شیراز کا ہوائی اڈہ بس ننھا منا سا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیراز کی دھرتی پر قدم رکھتے ہی اس کی قدامت وعظمت کا احساس شروع ہو جاتا ہے۔ افسوس کہ موسم خزاں کا تھا، نہ پھول نہ پات۔ یہ یقین ہی نہیں آتا کہ وہ شہر ہے جس کے گل وگلزار کی تعریف سبھی کرتے ہیں۔ ہمارے ساتھ کچھ امریکن ٹورسٹ بھی تھے۔ معلوم نہیں ان لوگوں کو یہاں کیا ملتا ہے، نہ زبان سے علاقہ، نہ ادب وتہذیب سے نسبت۔ ایک کیمرہ لٹکایا، میم کو ساتھ لیا، جہاں کی تعریف سنی اُدھر سدھار لیے۔ ہمارے ساتھ سامان کا کھڑاک نہ تھا۔ بس سواری کی تلاش تھی۔ ساتھ ہی میکڈویل ایجنسی تھی۔ شیراز اور اصفہان میں (اور جگہ بھی ہوگا) یہی ایجنسی ٹورسٹ بیورو کا کام بھی کرتی ہے

Not For Sale

اور ہوا پیمائی ایران کے ٹکٹ دینے کا بھی۔ ان سے ہوٹل کی بات کرتے کرتے معلوم ہوا کہ اگر شب بھر قیام کرنے کی بجائے ابھی سے ٹیکسی لے کر آغاز کر دیں تو تمام مقام دیکھے جا سکتے ہیں۔ مسجدِ وکیل وحافظ وسعدی کے مزار، دروازۂ قرآن وغیرہ تو شہر ہی میں ہیں۔ میوزیم بند ہے۔ سوال فقط تختِ جمشید کا رہ جاتا ہے جو ساٹھ ستر میل کی مسافت ہے۔ میکڈویل ایجنسی والوں نے کرائے کا لمبا چوڑا حساب بتایا جو امریکنوں کے حساب سے ٹھیک ہی ہوگا۔ پھر وہ اصرار کر رہے تھے کہ پہلے تخت جمشید جاؤ۔ شہر میں کیا دھرا ہے۔ اِدھر اپنا دل تھا کہ حافظ اور سعدی میں اٹکا تھا لہٰذا ہم نے ٹیکسی لی اور سیدھے مزارِ حافظ کا راستہ لیا کہ وہی پہلے پڑتا تھا۔ حافظ کے احاطے میں دیکھا کہ جا بجا لوگوں کی ٹولیاں بیٹھی ہیں اور ایک کونے میں کوئی شخص ٹیپ ریکارڈ لیے کوئی پروگرام ریکارڈ کر رہا ہے۔ اونچی کرسی پر مزار ہے لیکن مزار کے گرد کوئی جالی یا پردہ نہیں کہ اندر اطمینان سے بیٹھ کے کوئی فاتحہ پڑھ سکے۔ کہتے ہیں: یہاں فال کے لیے دیوان کا ایک نسخہ رکھا رہتا ہے، ہمیں نظر نہ آیا۔ لڑکے لڑکیاں تفریح کے موڈ میں گھوم رہے تھے۔ ہم نے دور ہی سے فاتحہ پڑھی اور ٹیکسی والے سے کہا: چلو! اب سعدی کے مقبرے۔

مزارِ شیخ کے احاطے کے پھاٹک پر ہی یہ شعر رقم تھا:

ؔ زخاکِ سعدیِ شیراز بوئے عشق آید
ہزار سال پس از مرگِ اُو اگر بویم

احاطے کے اندر داخل ہوتے ہی طبیعت ایک عجیب سرور سے آشنا ہوئی۔ یوں لگتا تھا کہ ذرّہ ذرّہ دامن کشاں ہے۔ مقبرہ نہایت سادہ ہے اور ایک کاریڈور کے سرے پر بہت مختصر سا گنبد ہے جس کے چار طرف جالیاں، اندر مزار ہے۔ بہت سی عورتیں مزار کو بوسہ دے رہی تھیں۔ معلوم ہوا منتیں بھی مانی جاتی ہیں۔ ایک طرف خدمت گار کھڑا تھا اور کسی عقیدت مند خوشنویس کی لکھی ہوئی گلستان کی ایک حکایت اور بوستان کی ایک نظم دیوار پر آویزاں تھی۔ جب مزار سے عورتیں رخصت ہوگئیں، ہم فاتحہ کے لیے بڑھے۔ لیکن جانے کیا ہوا؟ معاً جی بھر آیا اور ہم نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے تو آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب رواں تھا۔ جتنا ضبط کرنے کی کوشش کرتے تھے، سیلاب اور اُمڈتا تھا۔ فاتحہ بہت طویل ہوگئی۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ محافظ ہماری یہ کیفیت

دیکھے۔ جانے کتنے عالم آنکھوں کے آگے آئے۔ وہ دن جب ہم نے اپنے گاؤں میں گلستان کے درس کا آغاز کیا تھا۔ ہمیں یاد ہے کہ: ''در بابِ شاہاں'' سے ہمارا درس شروع ہوا تھا اور ''زندیست نام فرخ نوشیرواں'' والی حکایت پہلی تھی۔ پھر ''قافلۂ دزدان بر سرِ کوہے نشستہ بودند'' یاد آئی۔ ہم نے سعدی کو ہمیشہ اپنا رفیق اور دوست سمجھا اور شاید یہ داخلی رفاقت اور دوستی تھی جس سے یہ حال ہوا۔ بار بار خیال آتا تھا: یہی نواح ہوں گے، جن میں ہمارا شیخ سیر کرتا تھا، گھومتا پھرتا تھا اور پھر لوگ یہاں اس کا جنازہ لائے ہوں گے۔ یہ وہی سعدی ہے، یہ وہی شیراز ہے۔ یعنی وہی پہنائی ہے جس سے بچپن سے غائبانہ آشنائی ہے۔ یقین نہ آتا تھا۔

شیخ کے مزار سے رخصت ہونے کو جی نہ چاہتا تھا۔ اُٹھتے تھے اور بیٹھ جاتے تھے۔ حافظ کے مزار پر قطعاً یہ کیفیت نہ تھی۔ وہاں ہم خالی گئے، خالی آئے۔

یادگار کے لیے ہم نے کیاریوں پر نظر ڈالی۔ صاحبِ گلستان کے چمن میں گلاب کا کوئی پھول اس وقت نظر نہ آیا۔ ناچار گُلِ صد برگ کا ایک غنچۂ نوشگفتہ لیا اور جیب میں رکھ لیا۔ شیخ کی یہ یادگار ایک متاعِ عزیز کی طرح ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتی ہے۔

اگلی منزل تھی............................مسجدِ وکیل

نادر شاہ کے قتل کے بعد شیراز میں کریم خان زند کی حکومت رہی جو اپنی نیک نفسی اور رعایا دوستی کے لیے مشہور تھا۔ اس نے بادشاہ کا لقب اختیار کرنے سے انکار کیا تھا اور خود کو وکیل الرعایا ہی کہا۔ اس کے عہد میں شیراز کے بھاگ کھلے اور یہ مسجد بھی اس کی یادگار ہے جس کی ٹائیلیں بہت خوبصورت ہیں۔ ساتھ ہی مشہور بازارِ وکیل ہے۔

وہاں سے ٹیکسی لی اور دروازۂ قرآن دیکھا۔ ایک زمانے میں شیراز کے گرد فصیل اور دروازے تھے جن میں فقط یہی باقی ہے۔ اس کا نام قرآن دروازہ اس لیے ہے کہ اس کے اوپر برکت کے لیے قرآنِ مجید کا ایک نُسخہ رکھا رہتا تھا جو اب تہران کے عجائب گھر میں ہے۔ اصفہان اور تختِ جمشید سے آنے والی شاہراہ اسی دروازے کے نیچے سے گزرتی ہے۔

ابھی شاید بارہ کا عمل تھا اور تختِ جمشید بند تھا۔ ہم نے ایک سالم ٹیکسی روکی۔ اس نے پندرہ تومان کہے، ہم نے دس۔ آخر بارہ طے ہو گئے۔ ڈرائیور کا نام منصور تھا اور اس نے دعویٰ کیا کہ مجھے تھوڑی انگریزی بھی آتی ہے۔ یہ دعویٰ اس کے ہمنام منصور کے دعویٰ انا الحق سے بھی زیادہ مبالغہ آمیز تھا، کیونکہ اصل میں اسے صرف ایک لفظ آتا تھا: Yes اور اسے وہ مسلسل اور متواتر استعمال کرنے پر مصر تھا۔ ہم فارسی میں لمبی چوڑی گفتگو کرتے تھے اور وہ Yes کہہ کر فارغ ہو جاتا تھا۔ گفتگو کم و بیش یوں رہی تھی۔

سوال: (فارسی میں) میاں منصور! تم شیراز کے رہنے والے ہو یا باہر کے۔

جواب: Yes

سوال: یہاں سے اصفہان کے کوس پر ہے؟

جواب: Yes

سوال: ہمارا جہاز ساڑھے تین بجے روانہ ہوتا ہے یا چار بجے۔

جواب: Yes

آخر ہم نے نہایت عاجزی سے کہا کہ ہم انگریزی نہیں سمجھتے، فارسی میں گفتگو کرو۔

بہر حال انگریزی کیسی بھی ہو، ٹیکسی منصور کی اچھی تھی اور خوب چلتی تھی۔ راستے میں ہم نے پوچھا: افسوس! رُکنا باد نہیں دیکھا۔ اس وقت ہم ایک نالے کے پاس سے گزر رہے تھے۔ منصور نے کہا: آقا! یہی رُکنا باد ہے۔ یہ ایک سوکھا نالا تھا۔ حافظ صاحب یہیں سیر کر کے خوش ہو جاتے ہوں گے۔ منصور نے کہا: بہار کے موسم میں آیئے اور سبزے کی بہار دیکھیے۔ یہ موسم شیراز دیکھنے کا نہیں ہے۔ گھاٹیاں آتی تھیں، گزر جاتی تھیں۔ آخر پچپن ساٹھ میل جانے کے بعد افق پر دارا کے محل کے میناروں کی تحریر نظر آئی۔ آخر آ گیا نا تختِ جمشید۔

ساڑھے بارہ بج رہے ہیں اور دھوپ خاصی تیز ہو گئی ہے۔ دارائے اعظم کا شہر عذار سامنے ہے۔ حد نظر تک محلوں کے خرابے اور ستونوں کی قطاریں نظر آتی ہیں۔ ڈھائی ہزار سال پہلے یہیں تیسرے دارا اور اسکندرِ اعظم کی فوجوں [illegible] جہاں اب پیپسی کولا کا سٹال ہے۔ پیپسی

کولا تو ایک طرف اس وقت اس غریب کے منہ میں کوئی پانی چوانے والا بھی نہ تھا۔ یہ جو امریکی ایمبولینس یہاں کھڑی ہے، بہت بعد میں پہنچی اور شیراز کا مشہور نمازی ہسپتال بھی کوئی ڈھائی ہزار سال دیر سے بنا۔

دارا سے بھی ہماری ملاقات پرانی ہے۔ اس زمانے میں ہم سکول کی ابتدائی جماعتوں میں پڑھتے تھے۔ اسکندرِ اعظم کے ہاتھوں دارا کی شکست اور تباہی کا حال پڑھ کر چنداں افسوس نہ ہوا تھا کیونکہ اسکندرِ اعظم کو ہم مسلمان سمجھتے تھے...... اسکندرِ اعظم پر ہی کیا موقوف ہے، جتنے ناموں میں ف، ق، غ، ظ وغیرہ آئیں، وہ ہندو تو بہر حال نہیں ہو سکتے تھے مثلاً: فیلقوس، ارسطو، افلاطون، فیثا غورث، سقراط، بقراط اور ان دنوں ہمارے نزدیک قومیں فقط دو تھیں: ہندو اور مسلمان۔ افسوس ہوتا تھا کہ اسکندر دریائے بیاس کے مغربی کنارے سے کیوں لوٹ گیا۔ ہمارا گاؤں بیاس کے مشرق میں کوئی زیادہ دور تھوڑی تھا۔ ''اے آمدنت باعثِ آبادیٔ ما۔''

یہ جو چٹانوں کا سلسلہ تختِ جمشید کے پس منظر میں نظر آتا ہے، کوہِ رحمت کہلاتا ہے۔ تختِ جمشید کو جمشید کیوں کہتے ہیں؟ کوہِ رحمت میں رحمت کی [illegible] بات ہے اور وہ جو ہم نقشِ رُستم دیکھنے جائیں گے اس سے رُستم کا کیا تعلق ہے؟ یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ یہیں کہیں تختِ جمشید سے سو سال پہلے سیروسِ اعظم کا بنا کردہ شہر پازرگاد تھا اور انھی نواحات میں اصطخر کی آبادی تھی۔ اصطخر تو عہدِ اسلام میں کئی صدیوں تک مشہور رہا۔ اب یہ تینوں شہر محض خرابے ہیں۔

[illegible]

کھنڈرات کی کرسی زمین سے کوئی تیس چالیس فٹ اونچی ہے اور اس پر چڑھنے کے لیے چوڑی سیڑھیوں کا سلسلہ ہے۔ ان سیڑھیوں پر گھوڑے مع سواروں کے ٹاپیں مارتے چڑھتے تھے۔ لیجیے! اب مسطح میدان ہے۔ بہت سے محلوں میں تو میناروں کے فقط ٹھنٹھ باقی ہیں لیکن بعض منارے اب بھی آسمان سے باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ دیواریں کئی کئی فٹ تک قائم ہیں اور دروازے تو اکثر جگہ ڈھائی ہزار سال سے یونہی کھڑے ہیں اور ان کی نقاشیوں کا جلال قائم ہے۔ کہیں شیروں کے مجسمے ہیں، کہیں بیلوں کے بت۔ یہاں تمام تھا۔ یہاں دیوانِ خاص تھا۔ اب آپ دھوپ کی پروا نہ کرتے ہوئے چلتے چلیے، محلوں کی وسعت سے نہ

گھبرائیے۔ آخر بنانے والے اپنے زمانے کے جہاں پناہ تھے۔ اس زمانے میں آپ کو کون یہاں گھسنے دیتا۔ وہ تو وہ، ان سیاحوں کی ہڈیاں بھی گل گئیں جنھوں نے اپنے ناموں کو دوام عطا کرنے کے لیے انھیں مختلف دروازوں اور محرابوں پر ٹھیکریوں سے کندہ کر دیا ہے۔ کوئی کتبہ جرمن میں ہے، کوئی فرنچ میں۔ ایک ۱۸۹۶ء کا ہے نیویارک ٹائمز کے نامہ نگار کا۔ ایک کی تاریخ ۱۸۵۸ء ہے، ایک ۱۸۳۶ء کا بھی۔ صحنوں، صحنچوں، ایوانوں میں سے گزرتے ہوئے ایک میوزیم میں پہنچتے ہیں۔ چھوٹا سا میوزیم ہے کیونکہ یہاں کے آثار کچھ تہران چلے گئے، کچھ اپنے آبا کی کتابوں کی طرح لندن اور پیرس میں۔ تختِ جمشید کے میوزیم میں زیادہ تر چھوٹے بڑے مٹکے مٹکیاں ہیں، جلی ہوئی لکڑی کے کچھ ٹکڑے بھی، کیونکہ آخر سارا محل آگ کے سپرد کر دیا گیا تھا۔

تختِ جمشید میں سب سے رفیع الشان محل تو دارا کا ہے۔ دوسرے نمبر پر اس کے جانشین خرخشاس اوّل کا صد ستوں محل اس کا نام ''اپادانا'' ہے جس کو داریوش (دارا) اوّل نے شروع کیا اور اس کے بیٹے نے مکمل کیا۔ یاد رہے کہ اسکندر سے لڑتے ہوئے جو شہنشاہ مارا گیا، وہ دارا نام کا تیسرا بادشاہ تھا۔ اسی طرح کئی بہرام ہوئے ہیں اور کئی خرخشاس۔ اپاداما کے تیرہ ستون ابھی باقی ہیں اور محل کے مشرقی زینے پر شاہِ معظّم کی خدمت میں ۲۸ قوموں کے لوگوں کو نذریں لاتے دکھایا گیا ہے۔ اس کے پہلو میں دارا کا پرائیوٹ محل ہے جو ''تکارا'' کہلاتا ہے اور اس کے دروازے پر شاہ کے ایک عفریت سے لڑنے اور اس کے سر میں تلوار بھونکنے کی تصویر مرتسم ہے۔ بادشاہ کی ڈاڑھی اور کپڑوں میں جواہر نکے تھے، اب فقط سوراخ باقی ہیں۔ اس طرح ایک نجی محل خرخشاس اول کا بھی۔ پھر ایک ملکہ کا محل، جس میں خدام اور لونڈیوں کے لیے حجرے ہیں۔ جو عمارت میوزیم کی ہے وہ پہلے استقبال گاہ تھی۔

نقشِ رستم، تختِ جمشید سے چار چھے میل آگے ہے۔ ہم نے جی میں سوچ لیا تھا کہ وہاں جانے کے دو چار تومان ڈرائیور کو اور دے دیں گے۔ ہم نے کہا: میاں منصور! چلو نقشِ رستم کے نقوش تو سڑک پر ہی سے نظر آ جاتے ہیں، باقی رہے دیوار میں بنے ہوئے حجروں میں تابوت، ان کے دیکھنے میں پانچ دس منٹ لگیں گے۔ ان حجروں کے دہانے سڑک سے کوئی سو فٹ سے زیادہ اونچائی پر ہوں گے۔ پرانی تحریروں کے

مطابق وہاں تک رسوں سے چڑھتے تھے۔ تابوت بھی یونہی کھینچے گئے تھے۔ اب ایک تنگ گول زینہ لوہے کا لگا دیا گیا ہے۔ ان مقبروں اور تابوتوں کا حصہ بہت تنگ و تاریک ہے۔ پہاڑ کو اندر سے کھود کر بنایا گیا ہے۔ باہر سڑک کے رُخ کی تصویریں اور کتبے ساسانی بادشاہ اردشیر کے ہیں، یعنی تیسری صدی عیسوی کے۔ ایک جگہ بہرام دربار لگائے ہوئے ہے۔ ان تابوتوں میں ایک تو دارایوش اوّل کا بیان کیا جاتا ہے، دوسرے کے متعلق قیاسات اور اختلافات ہیں۔

لیجیے صاحب! جو شہر صدیوں میں بسے اور اسکندر کو آ کر ڈھانے پڑے، ہم نے ڈھائی گھنٹے میں دیکھ لیے۔ اب پھر ہم تھے اور شیراز کی سڑک، جس پر منصور کی ٹیکسی ساٹھ میل کی رفتار سے فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔ ہم نے اپنے جی ہی جی میں حساب جوڑا، بارہ تومان تختِ جمشید تک اور جیسا کہ رستے میں طے ہو گیا تھا۔ دس تومان واپسی کے، کل ۲۲۔ نقشِ رستم تک جانے کے دو تین چار پانچ سمجھ لیجیے۔ شہر سے ہوائی اڈا دور نہیں۔ دو تین اس کے بھی، گویا تیس تومان۔ چلیے! منصور بھی خوش ہو جائے گا، لیکن:

من در چہ خیالم و فلک در چہ خیال •

تختِ جمشید سے واپسی پر شیراز کی سڑک پر فراٹے بھرتے ہوئے حافظ و سعدی کے ذکرِ لطیف میں بات سے بات نکالتے ہوئے منصور نے کہا: ''آپ مجھے کتنے پیسے دیں گے؟''

ہم نے کہا: ''برادر بجان برابر! کوئی بے اعتباری ہے کیا؟ تمھیں خوش کر دیں گے۔''

بولے: ''نہیں! یہ بات نہیں، یہ ٹیکسی ہی آپ کی ہے۔ آئندہ جب کبھی جنابِ عالی شیراز تشریف لائیں تو اس خانہ زاد منصور کو یاد رکھیں۔ اس ناچیز کے ہوتے کسی اور سے آپ خدمت لیں گے تو میرا دل توڑیں گے۔''

ہم نے کہا: ''واہ ! یہ کبھی ہو سکتا ہے؟''

ائیر پورٹ پر پہنچ کر ہم نے بائیس یا پچیس کی بجائے جو ان کا حق ہوتا تھا، تیس تومان منصور صاحب کی مٹھی میں دے دیے۔

بولے: ''یہ کیا؟ یہ تیس ہیں، اتنے تو میں نہیں لوں گا۔''

• میں کس خیال میں ہوں اور آسمان کس خیال میں ہے۔

ہم نے کہا: ''لے لو، لے لو، ہم کوئی بطور بخشش یا انعام تھوڑا ہی زیادہ دے رہے ہیں، ان پانچ تومان کو ہمارا دوستانہ نذرانہ سمجھ کر قبول کرو۔ تکلف نہیں کیا کرتے۔''

لیکن منصور صاحب ناک بھوں چڑھا کر بولے: ''جناب! پینتیس سے ایک تومان کم نہ لوں گا۔''

''پینتیس؟ وہ کیسے؟'' ہم نے پوچھا۔ ''۱۲+۱۰ تو ۲۲ بنے، تھوڑا اوپر لگا لو۔ ۲۵ ہوگئے چلو! ۲ اور سہی، لیکن ۳۵ کیسے؟''

بہت سی فارسی بول کر فرمایا: ''حساب کو چھوڑیے پینتیس ہی ہوتے ہیں''۔ ہم ٹیکسی سے نکل چکے تھے لیکن وہ بھلا مانس جو تھوڑی دیر پہلے تک خانہ زاد بنتا تھا، رستہ روک کر کھڑا ہوگیا۔ ''جناب! پینتیس دیجیے پینتیس۔''

اب ہوائی اڈے کے حمال اور دوسرے بے فکرے تماشائی آن جمع ہوئے۔ ان سے فریاد یا استغاثہ کیا کرتے۔ منصور ہم سے اچھی اور تیز فارسی بولتا تھا۔ ممکن ہے ہم مقدمہ جیت بھی جاتے، لیکن اصفہان کا جہاز ضرور چھوٹ جاتا۔

پس ہم نے کہا: ''لو میاں! ۳۵ تومان۔ قربانت شوم! تم تو کہتے تھے، ٹیکسی آپ کی ہے۔''
منصور نے نہ ہمارے سلام کا جواب دیا نہ کوئی اور بات کی۔ ٹیکسی لے یہ جا وہ جا۔

(ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے جوابات لکھیے۔

(ا) مصنف سحر خیزی کے بارے میں کیا کہتا ہے؟

(ب) حافظ کے مزار پر ان کے دیوان کا نسخہ کیوں رکھا جاتا تھا؟

(ج) شیخ سعدی کے مزار پر مصنف کی کیا کیفیت ہوئی؟

(د) ڈرائیور منصور کی انگریزی کے بارے میں مصنف نے کیا مثال پیش کی؟

(ہ) دارا اور سکندر کون تھے؟

(و) ڈرائیور منصور اور مصنف کے درمیان کرائے کا کیا معاملہ پیش آیا؟

۲۔ درج ذیل جملوں کی وضاحت کریں۔

(ا) نہ زبان سے علاقہ، نہ ادب و تہذیب سے نسبت، ایک کیمرہ لٹکایا، میم کو ساتھ لیا، جہاں کی تعریف سنی اُدھر سدھارے۔

(ب) ہم نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے، تو آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب رواں تھا، جتنا ضبط کی کوشش کرتے تھے، سیلاب اور امڈتا تھا۔

(ج) ان سے فریاد یا استغاثہ کیا کرتے؟ منصور ہم سے اچھی اور تیز فارسی بولتا تھا، ممکن ہے ہم مقدمہ جیت بھی جاتے لیکن اصفہان کا جہاز ضرور چھوٹ جاتا۔

(د) یہاں کے آثار کچھ تہران چلے گئے، کچھ اپنے آبا کی کتابوں کی طرح لندن اور پیرس میں۔

(ہ) اس نے دعویٰ کیا کہ مجھے تھوڑی انگریزی بھی آتی ہے۔ یہ دعویٰ، اس کے ہم نام منصور کے دعوے انا الحق سے بھی زیادہ مبالغہ آمیز تھا۔

۳۔ امدادی فعل کی تعریف کریں اور مثالیں دیں۔

۴۔ درج ذیل الفاظ و تراکیب کو اس طرح جملوں میں استعمال کریں کہ مفہوم واضح ہو جائے۔

قدامت و عظمت، غنودگی، دیوانِ خاص، رفیع الشان، عفریت، خانہ زاد، بھلا مانس۔

۵۔ سفرنامے کی تعریف کریں اور اس کے فنی لوازمات لکھیں۔

جمیل الدین عالی

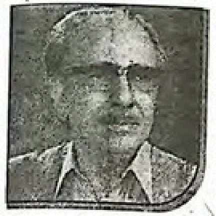

پیدائش: ۱۹۲۶ء

وفات: ۲۰۱۵ء

ملّی نغمہ ''جیوے جیوے پاکستان'' کے خالق جمیل الدین عالی دِلّی میں پیدا ہوئے۔ دلّی سے بی اے کرنے کے بعد عملی زندگی کا آغاز وزارتِ تجارت میں اسسٹنٹ کی حیثیت سے کیا۔ بعد میں مقابلے کا امتحان پاس کیا اور انکم ٹیکس افسر مقرر ہوئے۔ ایوانِ صدر میں بھی بطور افسر بکارِ خاص خدمات سرانجام دیں۔ وزارتِ تعلیم سے بھی منسلک رہے۔ کاپی رائٹ رجسٹرار اور نیشنل پریس ٹرسٹ کے سیکرٹری بھی رہے۔ ۱۹۶۱ء میں یونیسکو کی فیلوشپ ملنے کے بعد مختلف ممالک کی سیاحت کی۔ پاکستانی مندوب کی حیثیت سے بھی کئی ممالک کے دورے کیے۔ رائٹرز گلڈ کے قیام کے بعد اس کے اعزازی مرکزی سیکرٹری اور سیکرٹری جنرل بھی رہے۔ انجمنِ ترقیٔ اردو کے مرکزی رکن اور معتمد اعزازی رہ چکے ہیں۔ روزنامہ جنگ میں ان کا کالم باقاعدگی سے چھپتا رہا ہے۔

ان کے سفرناموں کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں: ''جمیل الدین عالی نے تماشا میرے آگے اور ''دنیا میرے آگے'' میں سفر کے فوری تاثر کو اخباری کالم میں سمیٹ لیا۔ انھوں نے ادب کے کلاسیکی پس منظر کو زندگی کے موجودہ مناظر سے مربوط کیا۔ ان سفرناموں میں مصنف خودنگر و خداوندِ خودی بن کر ظاہر ہوتا اور مشرقی درویشی کا بھرم قائم رکھتا ہے۔''

تصانیف : اے میرے دشتِ سخن، دُعا کر چلے، صدا کر چلے، انسان، لاحاصل، تماشا مرے آگے اور دنیا مرے آگے وغیرہ

روم: زندہ شہر اور مُردہ شہر

''اگر آپ نے رومی پراٹھا نہیں کھایا تو کچھ نہیں کھایا''۔ اطالوی سینوریٹا، مالک ہوٹل ووڈ کاک نے فرمایا۔ میں دل ہی دل میں ہنسا۔ یہ ہمیں پراٹھا کھلائیں گی۔ ارے مائی! اپنا تو کلچر ہی پراٹھا کلچر ہے، مگر اطالوی پراٹھا تو غضب کا نکلا۔ اس کا اصل نام ہے پیتسا (پی ت سا) جو انگریزی میں پی زا (Pizza) بولا جاتا ہے۔ میدہ گوندھ کر یہ چوڑی نان بنائی، پھر انڈا ملا، ٹماٹر لیپا، پیاز پوتی، ادرک، کالی مرچ نمک، پسا ہوا گوشت چھڑکا اور تندور میں رکھ دیا۔ کچھ تندور بجلی کے ہوتے ہیں، کچھ اصلی تے وڈے پاکستانی تندور ہوتے ہیں۔ دہکتے ہوئے تندور، جو آن کی آن میں مٹی کو کندن بنا سکتے ہیں۔

اب اس آنچ میں تپ کر جو رومی پراٹھا یا پیتسا نکلتا ہے، اسے اسی وقت کھا لیجیے۔ زبان ذرا سی جلے گی، مگر وہ مزا ہی کیا جس میں جلنا نہ پڑے۔ ٹھنڈا ہوا اور سارا مزا کافور ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے آٹے میں لئی ملا کر کھا رہے ہیں، کیونکہ انڈے، گوشت، ٹماٹر سب ٹھنڈے ہو کر ہمواری اور یکسانیت اختیار کر لیتے ہیں۔ ہاں! اتنا ضرور ہے، پیتسا کو بار بار گرم کر کے کھایا جا سکتا ہے۔

پیتسا اٹلی کی سب سے سستی اور بقولِ کسے تگڑی غذا ہے۔ ایک پراٹھا بمشکل کھایا جاتا ہے۔ اپنے جیسوں کا پیٹ آدھے میں بھر جاتا ہے۔ اس لیے قیمتیں بھی ٹکڑوں کے حساب سے ہیں۔ ضروری نہیں کہ پورا پراٹھا مول لیا جائے، پونا بلکہ پاؤ بھی ملتا ہے۔ امرا اسے اضافی ڈش کے طور پر کھاتے ہیں، جیسے ہمارے امرا کے دسترخوان پر کئی کئی کھانے ہوتے ہیں اور پتا نہیں چلتا کہ:

کیا چیز ہے بنیادی

اور یہ ایسپاگیتی ہے، ای س پا گے تی، جسے یہاں کے انگریزی دان اسپاگیٹی (Spaghetti) وغیرہ

کہتے ہیں۔ حالانکہ سویاں کہہ سکتے ہیں. موٹی موٹی، لمبی ہوتی ہیں کہ روم سے کراچی تک بحری تار کا سلسلہ قائم کرنے میں کام آئے۔ چمچے، کانٹے، چھری، تینوں کی مدد سے کھانا پڑتا ہے۔ ہلکے مکھن کے سالن میں سیر سیر بھر، موٹی موٹی، لمبی لمبی سویاں ایک بڑا سا پتیسا اور آس پاس نہایت اطمینان سے لپ لپ کھاتے ہوئے ماہرین، جو کن انکھیوں سے میری بے بسی کو دیکھتے جاتے ہیں

اطالوی لنچ کھانے کے بعد قیلولہ ضرور کرتے ہیں۔ یورپ کے انتہائی شمال میں ہونے کی وجہ سے یہ ملک یورپیوں کے بقول: ''گرم ہے''۔ میدے کا کھانا کھا کر یوں بھی نیند آتی ہے۔ چنانچہ ایک بجے دوپہر سے چار بجے سہ پہر تک کاروبار تقریباً بند رہتا ہے۔ لنچ ٹائم چار بجے ختم ہوتا ہے تو یار لوگ دو دو گھنٹے اور کام کرتے ہیں، مگر ان دو گھنٹوں میں بھی پندرہ منٹ چائے کے وقفے کے نام پر آدھ پون گھنٹے گپ اور آرام فرماتے ہیں۔ چھے بجے اوقاتِ دفتر ختم ہوئے اور:

ع پھر موجِ ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی

مگر میں ابھی اس موج کے پیچوں سے پوری طرح واقف نہیں ہُوا۔ اکیلا آدمی کب تک گھومے، کہاں کہاں گھومے اور سب سے بڑی دقت: زبانِ یار جوتر کی ہے، اس کا کیا علاج۔ ''دو دن میں اطالوی سیکھ''۔ بار بار پڑھی، بلکہ ہر وقت جیب میں رہتی ہے مگر کچھ خاص کام نہیں آتی۔ چنانچہ میں نے اپنا پڑاؤ ایک پُل پر لگایا ہے جو میری طرح تنہا بھی ہے اور ہنگامہ پرور بھی۔ تنہا یوں کہ اکیلا ہے، ایک ہے اور بے جان ہے۔ ہنگامہ پرور یوں کہ اس کے آس پاس بہت سے ہنگامے ہوتے رہتے ہیں۔ یہ قدیم روما کا سب سے مشہور پُل ہے۔ انگریزی میں اس کا نام وہی انگریزی قسم کا ہے، یعنی ٹائبر بینک۔ جب عیسائیت نے زور پکڑا تو اس کا نام سینٹ انجلو کا پُل رکھ دیا گیا کیونکہ اس کے پیچھے سینٹ انجلو کے نام سے ایک عظیم الشان قلعہ بنا ہوا ہے۔ مگر اصل میں ایسے مقامات کے نام کوئی نہیں ہوتے جیسے دنیا کا کوئی نام نہیں ہے، زندگی کا کوئی نام نہیں ہے۔

میں تقریباً روز یہاں آتا ہوں اور یہ جو اُلٹے ہاتھ کو دریا کے کنارے دیوار بنی ہوئی ہے، اس پر دریا کی طرف پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ پیچھے درختوں کا سایہ ہے جو دھوپ کی شدت سے محفوظ رکھتے ہیں۔ سامنے

وے رے ہے جو ماضی کا بائیسکوپ دکھاتا ہے۔

اس جگہ کا نام ہے: کیپیٹول (کے پی ٹول)۔ یہی نام آپ نے امریکی صدر مقام واشنگٹن کے سلسلے میں بار بار سُنا ہوگا۔ وہاں کیپیٹول نامی ایک گنبد والی عمارت ہے جہاں امریکی مقننہ یعنی سینٹ یعنی سنات بیٹھتی ہے۔ بقول امریکیوں کے: آج دُنیا کا سب سے اہم مقام کیپیٹول ہے۔ یہ لفظ بھی سنات کی طرح اٹلی سے امریکہ لے جایا گیا ہے۔ بہر حال ہم کو اس سے کیا غرض کہ کون کہاں سے کیا لے گیا ہے اور پھر اسے کس طرح اپنا لیا؟ خود ہماری ہزار ہا کتابیں لندن کے کتب خانوں میں مقید ہیں جن کے بل پر یورپین مستشرقین آج تک مشرقی علوم میں اپنی مہارت کی دھونس جھاڑتے ہیں۔

آپ کو معلوم ہے یا شاید معلوم نہیں کہ روم سات پہاڑوں پر بنا ہوا ہے۔ اب وہ پہاڑیاں سڑکوں کے اُتار چڑھاؤ میں بدل گئی ہیں اور کہیں کہیں محسوس ہو جاتا ہے کہ: ہاں! ''روم ایک دن میں نہیں بنا''۔ یہ عمارت بھی ان سات میں سے ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ قدیم زمانے میں یہ سیاسی اور مذہبی مرکز کا درجہ رکھتی تھی۔ اب سیاحوں کی زیارت گاہ ہے۔ اس جگہ سے بڑی بڑی یادیں وابستہ ہیں۔ ایک رومی حاکم ٹائرس گراچس ۱۳۳ قبل مسیح میں اسی مقام پر قتل کیے گئے تھے۔ یہ سامنے مندر ہے۔ مندر یا عبادت گاہیں، ان کے زینے ملاحظہ کیجیے۔ یہ سب اس وقت بنے ہیں جب رومۃ الکبریٰ کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ زوال پذیر قوم اپنے عروج کو نہ بھولی اور عروج حاصل کرنے میں ناکام ہوتے ہوتے اس کی یادگاریں قائم ہوتی گئیں۔ کیپیٹول قدیم رومۃ الکبریٰ کی نشانی نہیں، بلکہ ان جمہوری روایات کی یادگار ہے جو قدیم رومنوں نے قائم کی تھیں۔ سنہ پندرہ سو بیس میں اس کے حصار ٹوٹ گئے تھے اور مدتوں یہ بے ترتیب پڑی رہی۔ یہاں تک کہ مشہور مصور اور معمار مائیکل انجلو نے اس کی ترتیبِ نو اور تزئین کا منصوبہ بنایا۔

آپ روم سے اُکتا گئے ہوں گے، میں نہیں اُکتایا، بلکہ ابھی تو اصلی یعنی پرانا روم شروع ہی نہیں ہوا۔ لیکن چلیے ذرا روم سے باہر بھی ہو آئیں کیونکہ اٹلی صرف روم ہی نہیں ہے، حالانکہ یہ بھی درست ہے۔ کم از کم ہمارے لیے اٹلی روم کے بغیر کچھ نہیں۔

اب آدمی روم سے پہلے کہاں جائے۔ وینس خوب صورت اور قدیم شہر ہے جو پانی پر بنا ہوا ہے۔ یعنی جس کے گرد پانی ہے جہاں سڑکیں نہیں ہیں بلکہ سڑکوں کی جگہ چھوٹی چھوٹی نہریں ہیں۔ یا نیپلز، وہ بندرگاہ جس کے بارے میں ملاح اور سیاح طرح طرح کی کہانیاں ساتھ لاتے ہیں۔ یا سسلی چلیے گا۔ سسلی جس کا عربی نام صقلیہ ہے۔ جزیرہ صقلیہ جہاں پہاڑوں کے بیچ قدرت نے نیلے نیلے چشمے بنا رکھے ہیں اور جو سیاحوں کی جنت کہلاتا ہے۔ شاید آپ ''میلان'' جانا پسند نہیں کریں گے کیونکہ وہ ایک صنعتی شہر ہے جو جدید ہے اور اٹلی کا تجارتی اور صنعتی مرکز ہے۔ یوں بھی وہ شمال میں ہے اور اطالوی تاریخ اور حسن کے خزانے جنوب مغرب میں بکھرے ہوئے ہیں۔

یہ پومپی اِی ہے جسے انگریزی دان پومپی آئی کہتے ہیں۔ پومپی آئی نیپلز کے ساتھ ہے، بلکہ نیپلز میں ہے۔ لیکن:

ع ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

یہ ایک عظیم اور خوشحال شہر تھا، جو اجڑ چکا ہے، بکھر چکا ہے، ختم ہو چکا ہے اور شاید ابھی زندہ ہے۔ کئی سو برس ہوئے جب ایک قہرِ خداوندی نازل ہوا، ایک زلزلہ آیا اور پورا شہر زیرِ زمین چلا گیا۔ پومپی آئی، جسے دیکھنے یورپ ہی نہیں ایشیا تک زائرین جوق در جوق آتے تھے، لمحے بھر میں ختم ہوگئے۔ اس کے مکان کھنڈر بن گئے اور مکین کھنڈروں میں دفن ہوگئے۔

مجھے یہاں بابل کے کھنڈر یاد نہیں آئے۔ ان کی عظمت زیرِ زمین نہیں گئی تھی، بلکہ ان کو آسمان کھا گیا تھا۔ لیکن پومپی آئی کو زمین نے ہضم کیا اور اس طرح کہ آج تک ہزاروں ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی کوشش کے باوجود پورے شہر کو اُگلنے پر تیار نہیں ہے۔

بچّو! دوستو! بزرگو! افسرو! حاکمو! اللہ کی گرفت بہت سخت ہوتی ہے۔ یہ کھنڈر جو بائیں ہاتھ کو چلے گئے ہیں، نہ جانے کن کن اُمرائے عظام کے مسکن ہوں گے۔ انھی محلوں میں ہائی پالیٹکس بھی ہوتی تھی۔ شہزادے، وزراء، فوجی افسر ایک دوسرے کے موافق اور خلاف سازشیں کرتے تھے، پرمٹ بانٹتے تھے، عہدے تقسیم کرتے

تھے، بادشاہوں کو بنانے اور بگاڑنے کے چکر میں مبتلا رہتے تھے۔

اور اب وہ سب کھنڈر ہیں، خاک ہیں، خاک اور پتھر، جن کا عام اور مشہور نام، عبرت ہے اور جسے میں اس کی عمومیت کے باوجود بار بار دہراتا ہوں، مگر سننے والے نہیں سنتے، سمجھنے والے نہیں سمجھتے، اور اگر سمجھتے ہیں تو خدا سے ڈرنے کی بجائے غصے میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ تو آپ نے بھی سُنا ہے کہ غصّے سے نزلہ پیدا ہوتا ہے اور نزلے کے بارے میں سب حکیم ڈاکٹر جانتے ہیں کہ وہ کسی نہ کسی پر، گر کر رہتا ہے۔

چنانچہ پومپی آئی سے جلد باہر نکل جایئے مبادا آپ کو عبرت کی بجائے غصہ آ جائے، جس سے نزلہ پیدا ہو کر کسی عضوِ ضعیف پر گر جائے۔ کچھ ہی مدّت بعد نہ آپ رہیں گے نہ آپ کا غصہ، نہ آپ کا نزلہ، نہ عضوِ ضعیف، بلکہ سب پومپی آئی بن جائیں گے، سب کھنڈر ہو کر رہ جائیں گے، سب کا نام بدل جائے گا اور سب کو ایک ہی نام سے یاد کیا جائے گا اور نام وہی پُرانا نام ہے، تاریخ!

(دنیا میرے آگے)

مشق

ا۔ سوالات کے جوابات لکھیں۔

(ا) مصنف نے کن کن اطالوی کھانوں کا ذکر کیا ہے؟

(ب) پیزا کیسے تیار کیا جاتا ہے؟

(ج) اطالوی، کھانے کے بعد قیلولہ کیوں کرتے ہیں؟

(د) مایکل انجلو کون تھا؟

(ہ) اس سفرنامے میں جن اطالوی شہروں کا ذکر ہے اُن کے نام لکھیں۔

(و) پومپی آئی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

۲۔ متن کی مدد سے خالی جگہیں پُر کریں۔

(ا) اطالوی پراٹھے کا نام---------------ہے۔

(ب) رومن پارلیمنٹ کو انگریزی میں---------------کہتے ہیں۔

(ج) سامنے تے وے رے ہے جو ماضی کا---------------دکھاتی ہے۔

(د) زبان یارمن---------------

(ہ) میلان ایک---------------شہر ہے۔

(و) سسلی کا عربی نام---------------ہے۔

(ز) ---------------پانی پر بنا ہوا ایک قدیم شہر ہے۔

(ح) نزلہ ہمیشہ---------------پر گرتا ہے۔

۳۔ اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۴۔ اپنے کسی سفر کی رُوداد شگفتہ پیرائے میں بیان کریں۔

سفرنامہ:

سفرنامہ نگاری دنیا کے تقریباً ہر ادب کی ایک مستقل صنف رہی ہے۔ جب کوئی ادیب سفر کے لیے گھر سے باہر نکلتا ہے۔ خواہ وہ سفر اندرونِ ملک ہو یا بیرونِ ملک اور وہ اپنے سفر کے تمام احوال قلمبند کرے تو ایسی تحریر کو ''سفرنامہ'' کہتے ہیں۔

سفرنامے میں وہ کسی خطے یا کسی ملک کی تاریخ بھی شامل کرتا ہے اور اُس کا جغرافیہ بھی، وہاں کی تہذیب وتمدن بھی اور اُس جگہ کے معاشی ومعاشرتی حالات کی جھلکیاں بھی۔ ان تمام باتوں کو دلچسپ اور پرلطف بنانے کے لیے سفرنامہ نگار اُس میں کہانی کا عنصر شامل کر دیتا ہے۔ یعنی سفرنامہ نگار انجانی دنیا کی سیر کے دوران تحیر (تعجب، حیرت) اور تجسس (Suspense) کے جن مراحل سے گزرتا ہے۔ اُنھیں افسانوی رنگ دے کر اپنے سفرنامے کو قاری کے لیے دلچسپ اور معلومات افزا بنا دیتا ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سفرنامہ کسی ملک کی جغرافیائی، سماجی، معاشی اور معاشرتی حالات کی ایک دلچسپ اور مستند تاریخ ہوتی ہے۔ اُردو زبان کا پہلا سفرنامہ نگار یوسف حلیم خان کمبل پوش ہے۔

(ترجمہ بشیر احمد بلوچ)

لالچی وزیر

لوک کہانیاں عوام کے خیالات و جذبات کی ترجمان ہوتی ہیں۔ لوک کہانیاں تحریری شکل میں نہیں ہوتیں بلکہ سینہ بہ سینہ اور نسل در نسل چلتی رہتی ہیں۔ مختلف معاشروں، خطوں اور علاقوں کے سماجی، معاشی، سیاسی اور معاشرتی حالات ان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی کہانی کچھ تبدیلیوں کے ساتھ مختلف علاقوں میں رائج ہو۔

لوک کہانیوں میں مذہبی اور دینی عقائد کی بجائے خوش اعتقادی اور ضعیف اعتقادی کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔ لوک کہانی کے ذریعے کسی بھی مخصوص علاقے یا خطے میں بسنے والے لوگوں کے رسم ورواج، طور طریقے، زندگی گزارنے کے ڈھنگ اور ثقافتی اقدار و روایات کا اظہار ہوتا ہے۔

شاملِ نصاب کہانی بشیر احمد بلوچ کی مرتب کردہ کتاب ''بلوچی لوک کہانیاں'' سے لی گئی ہے۔ اس کہانی کا اسلوب سادہ اور عوامی ہے۔ اور یہی اسلوب کسی لوک کہانی کا خاصہ ہوتا ہے۔

ایک بادشاہ تھا۔ اس نے اپنے وزیر سے کہا کہ ملک میں سب سے خراب چیز کل صبح مجھے لا دو۔ وزیر اپنے گھر آیا تو سوچ سوچ کر کافی پریشان ہو گیا کہ معلوم نہیں، سب سے خراب چیز کون سی ہے؟ بادشاہ تو کل مجھے مار ڈالیں گے۔ وزیر اسی غم میں شہر سے بھاگ نکلا اور ایک ویرانے میں پہنچ گیا۔ اس نے بکریوں کا ریوڑ دیکھا۔ گڈریا اس کے ساتھ ہے اور کوئی نہیں۔

وزیر نے دیکھا کہ ساری بکریوں کے گلے میں سونے کی گھنٹیاں پڑی ہوئی ہیں۔ وزیر نے گڈریے سے پوچھا کہ تمھاری بکریوں کے گلے میں کیا پڑا ہوا ہے؟

گڈریے نے جواب دیا کہ بکریوں کے گلے میں پتھر بندھے ہوئے ہیں۔ وزیر نے پوچھا: یہ پتھر کہاں سے ملے گا۔ مجھے وہ جگہ بتاؤ۔

گڈریے نے کہا: رات کو میرے ساتھ چلو۔ جب صبح ہوگی تو میں وہ پہاڑ تمھیں بتلاؤں گا۔

وزیر گڈریے کے ساتھ ہولیا۔ رات ہوگئی۔ گڈریے کے گھر میں ٹھہرا۔ گڈریا اپنی بکریوں کے پاس ہی سو گیا۔ آدھی رات کو جب وزیر کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ گڈریا بیٹھا کچھ پڑھ رہا ہے۔ وزیر اُٹھ کر گڈریے کے پاس آ گیا۔ اُس نے دیکھا کہ گڈریے کے سامنے ایک بکری سو رہی ہے اور گڈریا کہہ رہا ہے: سبحان اللہ........

گڈریا وظیفہ پڑھتا رہا اور رات ختم ہوگئی۔

صبح ناشتا کرنے کے بعد وزیر نے کہا: اب وہ پہاڑ مجھے دکھاؤ۔ مجھے ضروری جانا ہے۔ گڈریے نے کہا: آج میں اُس طرف نہیں جا سکتا، تم آج یہیں بیٹھے رہو۔

وزیر نے گڈریے سے کہا: اچھا تو تم مجھے بکریوں کے گلے سے کچھ اتار کر دے دو اور بعد میں دوسرے پتھر لا کر ان کے گلے میں ڈال دو۔

گڈریے نے کہا: میں اپنی بکریوں کا دودھ جس برتن میں کُتے کو پلاتا ہوں۔ تم بھی دودھ اُس برتن میں پیو، جس طرح کُتا پیتا ہے۔ پھر میں بکریوں کے گلے سے پتھر اُتار کر تمھیں دے دوں گا۔ گڈریے نے کُتے والے گندے برتن میں دودھ لیا، پھر اس نے وزیر سے پوچھا: تم ہو کون؟ وزیر نے بادشاہ کا نام لے کر ساری بات بتائی کہ بادشاہ نے مجھے حکم دیا کہ سب سے خراب چیز میرے پاس لاؤ۔ اب مجھے پتا نہیں کہ سب سے خراب چیز کون سی ہوتی ہے؟ میں نے سوچا سونا لے کر بادشاہ کے پاس جاؤں گا تو وہ خوش ہو جائے گا۔

گڈریے نے کہا کہ سونا تو میں تمھیں بہت دکھاؤں گا۔ اس طرح تمھیں سونے کا پہاڑ دکھائی نہیں دے گا۔ تم کتے کی طرح کھاؤ پیو، پھر تمھاری آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ جائے گا اور تم دیکھو گے کہ یہ پہاڑ سب سونے کے ہیں۔

وزیر کتے کی طرح دودھ پینے کے لیے تیار ہوگیا۔ وہ اپنے گھٹنے تہہ کر کے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا تو گڈریے نے اُسے دھکا دیا کہ ہٹ جاؤ، ابھی تک تمھیں پتا نہیں چلا کہ سب سے خراب چیز کون سی ہے؟ ''لالچ'' سب سے خراب چیز ہے۔ سب کو خوار کر دیتی ہے۔ تم نے بھی لالچ میں آ کر اپنا حال دیکھا۔

وزیر واپس بادشاہ کے پاس چلا گیا اور اُسے بتایا کہ سب چیزوں سے بُری لالچ ہے۔ بادشاہ نے قبول کر لیا۔

مشق

۱۔ مختصر جواب لکھیں۔
   ا۔ لوک کہانی کی تعریف کریں۔
   ب۔ لوک کہانی پر کون سے عناصر اور عوامل اثر انداز ہوتے ہیں؟
   ج۔ بادشاہ نے وزیر سے کیا فرمائش کی؟
   د۔ وزیر نے ویرانے میں کیا دیکھا؟
   ہ۔ سونے کا پہاڑ دکھانے کے لیے گڈریے نے کیا شرط پیش کی؟
   و۔ گڈریے کے مطابق لالچ انسان کو کس حد تک گرا دیتی ہے؟
۲۔ گڈریے اور وزیر کے درمیان ہونے والی گفتگو اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔
۳۔ قواعد کے مطابق جملے درست کریں
   ا۔ وزیر تیار ہو گیا، کُتے کی طرح دودھ پینے کے لیے۔
   ب۔ دُنیا کی سب سے بُری چیز ہے لالچ۔
   ج۔ وزیر کی جب آنکھ کھلی آدھی رات کو۔
   د۔ گڈریے نے دودھ لیا، کُتے والے گندے برتن میں۔
   ہ۔ وہ دوزانو ہو کر اپنے گھٹنے تہہ کر کے بیٹھ گیا۔
۴۔ درج ذیل اقتباس کا خلاصہ لکھیں۔ جو اصل عبارت کی ایک تہائی سے زیادہ نہ ہو۔

آخر میں نے بھی بے حیائی کا جامہ پہن لیا۔ پٹنا قسمت میں لکھا ہے تو یوں ہی سہی۔ یوں بھی پٹنا، ووں بھی پٹنا۔ پھر کام کر کے اپنے آپ کو مفت میں کیوں تھکائیں۔ نکمے کا خطاب ملتا ہے۔ تو ملنے دو۔ برا بھلا کہتے ہیں تو کہنے دو۔ اس کان سنو اس کان اُڑا دو۔ آپ ہی بک بک کر تھک جائیں گے۔ یہ چال بھی گھورنے کی طرح کامیاب ہوئی۔ سب چیختے چلاتے مگر میں ٹس سے مس نہ ہوتا۔ جہاں کسی نے ذرا ہاتھ لگایا اور میں نے اس زور سے چیخ ماری گویا کسی نے گلا گھونٹ دیا ہے۔ کبھی کسی نے میری اس ترکیب کو دیکھ لیا تو راز کھل گیا، نہیں تو مارنے والا خود گھبرا گیا۔ دوسروں نے غل مچایا، کہ اے ہے! لونڈے کو مار ڈالا۔ کبھی تو مارنے والے صاحب مجھ سے زیادہ پٹ گئے اور کبھی ڈانٹ ڈپٹ ہو گئی۔ مگر ہم کام سے بچ گئے۔ مگر بابا ''ہر فرعونے را موسیٰ'' چھوٹی صاحب زادی صاحبہ کچھ مجھ سے زیادہ تیز تھیں۔ خود ہی مجھے مارتیں اور خود ہی رونے بیٹھ جاتیں۔ بھلا ان کے مقابلے میں مجھ بچارے کی کیا ہستی تھی۔ الٹی مجھ پر ہی لے دے ہوتی، غرض اس لڑکی کے ہاتھوں ناک میں دم آ گیا۔ مگر میں بھی بدلہ لیے بغیر تھوڑا ہی مانتا تھا۔ مارنے کی تو ہمت نہ ہوتی تھی ہاں کبھی بیگم صاحبہ ان پر خفا ہوتیں، تو میں بھی الٹی سیدھی بہت کچھ لگاتا۔ مہینہ مہینہ بھر پہلے کی باتیں یاد دلاتا۔ اگر قسمت نے یاوری کی تو کام بن گیا اور صاحبزادی صاحبہ کی خوب کندی ہو گئی۔ نہیں تو لترا پے کا الزام لگا۔ بیگم صاحبہ نے بیٹی کا غصہ مجھ غریب پر اُتار لیا۔

مکتوب نگاری

ہم روزانہ اپنے دوست احباب، رشتہ داروں، سرکاری وغیر سرکاری افسران وغیرہ سے حسبِ خواہش و ضرورت بات چیت کرتے ہیں۔ اگر یہی لوگ ہم سے دور ہوں تو ہم اپنی باتیں اُنھیں کاغذ پر لکھ کر بھیج دیتے ہیں۔ اس طرح اپنی گفتگو اور بات چیت کو لکھ کر بھیجنا خطوط نویسی یا مکتوب نویسی کہلاتا ہے۔ خط کو ''نصف ملاقات'' بھی کہتے ہیں کیوں کہ وہ باتیں جو ہم آمنے سامنے نہیں کرسکتے، وہ خط کے ذریعے کی جاسکتی ہیں۔ اس لحاظ سے خط کی اہمیت دوچند ہوجاتی ہے۔

خطوط نویسی کی تین اقسام ہیں۔ ان میں نجی (رسمی و دعوتی خطوط)، کاروباری اور سرکاری یا دفتری خطوط شامل ہیں۔ صنفِ نثر کے لحاظ سے ادبی اور علمی خطوط بڑے اہم ہوتے ہیں۔ مکتوب نگاری بھی اصل میں عربی و فارسی ہی کے ذریعے اُردو میں منتقل ہوئی۔ اُردو کے ابتدائی دور کی خطوط نویسی کے دور پر نظر ڈالنے سے بخوبی علم ہوجاتا ہے کہ اُردو کس قدر پُرتکلف عبارات، لمبے چوڑے القابات، بناوٹی اور ثقیل الفاظ سے مزیّن تھی۔ مگر سب سے پہلے مرزا غالبؔ نے فرسودہ اور پرانے طرزِ آداب والقاب سے گریز کیا۔ سیدھی سادی زبان میں مکتوب الیہ کو خطاب کیا۔ غالبؔ نے نئی وضع اختیار کرتے ہوئے مراسلے کو مکالمہ بنادیا۔ غالبؔ کی طبیعت اتنی شگفتہ اور ہمہ جہت تھی کہ اُن کی تحریریں فنی اور لسانی اعتبار سے بلند درجہ اختیار کرتے ہوئے ادبِ عالیہ کا حصہ بن گئیں۔ غالب کے بعد سرسید، محسن الملک، حالیؔ، ابوالکلام آزاد، مولانا شبلی نعمانی، اکبر الٰہ آبادی، علّامہ اقبالؒ، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی اور مولوی عبدالحق کے خطوط بھی ادبی دنیا میں اہمیت کے حامل ہیں۔

علّامہ اقبالؒ کے خطوط بھی ان کی شاعری کی طرح بہت اہم ہیں۔ اقبالؒ کے خطوط میں اُس عہد کے سیاسی وسماجی حالات کے ساتھ ساتھ ادبی مشاغل کی تفصیل بھی ملتی ہے۔ خطوطِ اقبالؒ کے کئی مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں، جن میں شادِ اقبالؒ، مکاتیبِ اقبالؒ، خطوطِ اقبالؒ اور انوارِ اقبالؒ اہم مجموعے ہیں۔

خطوطِ غالبؔ

(۱)

بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر

مرزا صاحب!

میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنادیا ہے، ہزار کوس سے بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ کیا تم نے مجھ سے بات نہ کرنے کی قسم کھائی ہے؟ اتنا تو کہو کہ کیا بات تمہارے جی میں آئی ہے؟ برسوں ہوگئے کہ تمہارا خط نہیں آیا۔ نہ اپنی خیر و عافیت لکھی، نہ کتابوں کا بیورا بھجوایا۔ ہاں، مرزا تفتہ نے ہاترس سے یہ خبر دی ہے کہ پانچ ورق پانچوں کتابوں کے آغاز کے ان کو دے آیا ہوں اور اُنھوں نے سیاہ قلم کی لوحوں کی تیاری کی ہے۔ یہ تو بہت دن ہوئے جو تم نے مجھ کو خبر دی ہے کہ دو کتابوں کی طلائی لوح مرتب ہوگئی ہے۔ پھر اب ان دو کتابوں کی جلدیں بن جانے کی کیا خبر ہے اور ان پانچوں کتابوں کے تیار ہونے میں درنگ کس قدر ہے؟ مہتممِ مطبع کا خط پرسوں آیا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ تمہاری چالیس کتابیں بعد منہائی لینے سات جلدوں کے اسی ہفتے میں تمہارے پاس پہنچ جائیں گی۔ اب حضرت ارشاد کریں کہ سات جلدیں کب آئیں گی؟ ہر چند کاریگروں کے دیر لگانے سے تم بھی مجبور ہو، مگر ایسا کچھ لکھو کہ آنکھوں کی نگرانی اور دل کی پریشانی دور ہو۔ خدا کرے ان تینتیس جلدوں کے ساتھ یا دو تین روز کے آگے پیچھے، یہ سات جلدیں آپ کی عنایتی بھی آئیں تاکہ خاص و عام کو جابجا بھیجی جائیں۔

میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہ رہا۔ نواب ضیاء الدین خاں اور نواب حسین مرزا جمع کرلیتے تھے۔ جو میں نے کہا اُنھوں نے لکھ لیا۔ اُن دونوں کے گھر لٹ گئے۔ ہزاروں روپے کے کتب خانے برباد ہوگئے۔ اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ہے، ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اس نے وہ کاغذ جو مجھ کو دکھایا، یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا۔ غزل تم کو بھیجتا ہوں اور صلہ میں اس خط کا جواب چاہتا ہوں۔

غالبؔ (۱۵ تا ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء)

(۲)

میر مہدی مجروح کے نام

بھائی! کیا پوچھتے ہو، کیا لکھوں۔ دِلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز بازار مسجد جامع کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پُل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دِلّی کہاں؟ ہاں! کوئی شہر، قلمروِ ہند میں اِس نام کا تھا۔ نواب گورنر جنرل بہادر پندرہ دسمبر کو داخل ہوں گے۔ دیکھیے، کہاں اُترتے ہیں اور کیوں کر دربار کرتے ہیں۔ آگے کے درباروں میں سات جاگیردار تھے کہ اُن کا الگ الگ دربار ہوتا تھا۔ جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹوڈی، لوہارو۔ چار معدومِ محض ہیں، تین جو باقی رہے، اس میں سے دوجانہ، لوہارو تحتِ حکومت ہانسی۔ حصار، پاٹودی حاضر۔ اگر ہانسی حصار کے صاحب کمشنر بہادر ان دونوں کو یہاں لے آئے، تو تین رئیس، ورنہ ایک رئیس بس۔ رہے دربارِ عام والے مہاجن لوگ، سب موجود۔ اہلِ اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں۔ میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدرالدین خان، بلی ماروں میں سگِ دُنیا موسوم بہ اسد۔ تینوں مردود، مطرود، محروم و مغموم۔

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

تم آتے ہو، چلے آؤ۔ جاں نثار خاں کے چھتے کی سڑک، خان چند کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ۔ بلاقی بیگم کے کُوچے کا ڈھنا، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز گول میدان نکلنا سُن جاؤ۔ غالب افسردہ دِل کو دیکھ جاؤ، چلے جاؤ۔ مجتہد العصر میر سرفراز حسین کو دُعا۔ حکیم الملک حکیم میر اشرف علی کو دُعا۔ قطب الملک میر نصیر الدین کو دُعا۔ یوسفِ ہند میر افضل علی کو دُعا۔

غالب

۲/ دسمبر ۱۸۵۹ء

(مکاتیب غالبؔ مرتبہ غلام رسول مہرؔ)

مشق

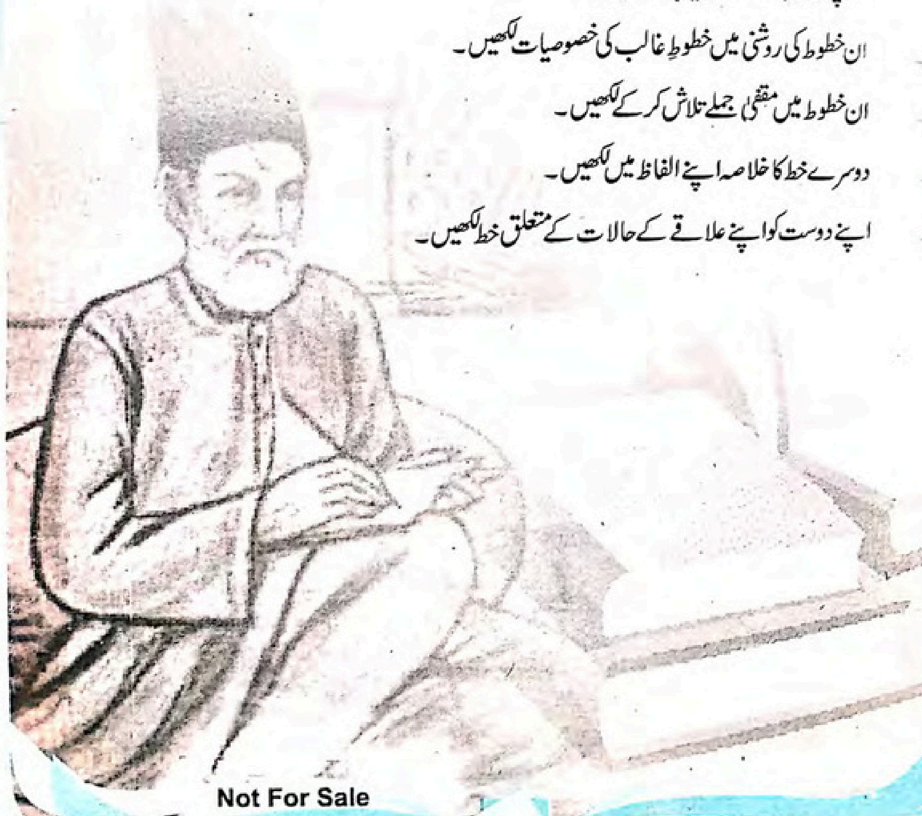

۱۔ غالبؔ نے مراسلہ کو مکالمہ کیسے بنایا؟ وضاحت کریں۔

۲۔ غالبؔ اپنے کلام کو کیوں ترستا ہے؟

۳۔ غالبؔ کے خطوط میں اکثر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے پیدا شدہ صورتِ حال کا ذکر ملتا ہے۔
آپ اِس بارے میں کیا جانتے ہیں؟

۴۔ ان خطوط کی روشنی میں خطوطِ غالب کی خصوصیات لکھیں۔

۵۔ ان خطوط میں مقفیٰ جملے تلاش کر کے لکھیں۔

۶۔ دوسرے خط کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۷۔ اپنے دوست کو اپنے علاقے کے حالات کے متعلق خط لکھیں۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے نام

لاہور

۲۷ ستمبر ۱۹۳۶ء

مخدومی جناب مولانا! نوازش نامہ ابھی ملا۔ اس سے پہلے بھی آپ کا خط مع تجویز ملا تھا، مگر میں علالت کے باعث جواب جلد نہ لکھ سکا۔ پہلے سے اچھا ہوں، مگر ابھی سفر کے لائق نہیں۔ خصوصاً جب کہ سفر بارہ گھنٹے سے زیادہ ہو۔ بہر حال اگر اردو کانفرنس کی تاریخوں تک سفر کے قابل ہو گیا تو اِن شاءاللہ ضرور حاضر ہوں گا، لیکن اگر حاضر نہ ہو سکا تو یقین جانیے کہ اس اہم معاملے میں کلیتاً آپ کے ساتھ ہوں۔ اگر چہ میں اردو زبان کی بحیثیت زبان خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا، تاہم میری لسانی عصبیت دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

آپ کی تجویز میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ میرے خیال میں صرف دو باتیں زیرِ بحث آئیں گی۔

اول یہ کہ: فنڈ کہاں سے آئے گا؟ عام مسلمان کی حالت اقتصادی اعتبار سے حوصلہ شِکن ہے۔ اُمرا توجہ کریں تو کام بن سکتا ہے مگر افسوس کہ اکثر مسلمان اُمرا مقروض ہیں۔

دوم یہ کہ صدرِ انجمن کا مستقر کہاں ہو؟ میرے خیال میں اس کا مستقر لاہور میں ہونا چاہیے اور اس کے لیے ایک سے زیادہ وجوہ ہیں۔

(۱) مسلمانوں کو اپنے تحفظ کے لیے جو لڑائیاں آئندہ لڑنا پڑیں گی، اُن کا میدان پنجاب ہوگا۔ پنجابیوں کو اس میں بڑی دقتیں پیش آئیں گی، کیونکہ اسلامی زمانے میں یہاں کے مسلمانوں کی مناسب تربیت نہیں کی گئی، مگر اس کا کیا علاج کہ آئندہ رزم گاہ یہی سرزمین معلوم ہوتی ہے۔

(۲) آپ انجمنِ اُردو سے متعلق ایک پبلشنگ ہاؤس قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی کامیابی بھی لاہور ہی میں ہو سکتی ہے، کیوں کہ یہ ایک بڑا پبلشنگ سنٹر ہے اور بہت سا طباعت کا کام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ انگریزی پبلشنگ کی طرف بھی یہاں کے مسلمان توجہ کر رہے ہیں۔

(۳) یہاں کے لوگوں میں اثر قبول کرنے کا مادہ زیادہ ہے۔ سادہ دِل صحرائیوں کی طرح ان میں ہر طرح کی باتیں سننے اور ان سے متاثر ہو کر ان پر عمل کرنے کی صلاحیت ، اور مقامات سے بڑھ کر ہے۔ ایک معمولی جلسے کے لیے آٹھ دس ہزار مسلمانوں کا جمع ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں، بلکہ بیس بیس ہزار کا مجمع بھی غیر معمولی نہیں۔ یہ بات پنجاب کے ہندوؤں میں بھی نہیں پائی جاتی۔

باقی رہا آپ کے خط کا آخری فقرہ۔ سو میں اس کے لیے آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ انسان جب تک زندہ ہے، افکار و تردّدات لازمۂ حیات ہیں۔

معنوی اعتبار سے تو مدت ہوئی، میں نے اسے آپ پر ہی چھوڑ دیا ہے۔ اب ظاہری اعتبار سے بھی چھوڑتا ہوں کیوں کہ آپ ایک صاحبِ عزم آدمی ہیں اور یہ بات مجھے مدّت سے معلوم ہے۔

زیادہ کیا عرض کروں۔ اُمید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر و عافیت ہوگا۔ والسلام

مخلص

محمد اقبال

والد گرامی (شیخ نور محمد) کے نام

لاہور ۳ / جون ۱۹۲۰ء

قبلہ و کعبہ السلام علیکم!

آپ کا والا نامہ ملا۔ الحمد اللہ کہ آپ کی صحت اچھی ہے اور مجھے یقین ہے اللہ تعالیٰ دیر تک آپ کا سایہ ہمارے سر پر رکھے گا۔ بھائی صاحب نے اس سے پہلے کسی خط میں آپ کے انتظام خوراک وغیرہ کے بارے میں لکھا تھا۔ یہ طریق اچھا ہے اور اسی کو دستورِ العمل بنانا چاہیے۔ میں نے یورپ کے مشہور حکیم کی کتاب میں دیکھا ہے کہ جو شخص ہر روز دہی کی لسی پیا کرے اس کی عمر بڑھتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کے جسم میں ایسے جراثیم ہیں جو قاطع حیات ہیں اور دہی کی لسی ان جراثیم کے لیے بمنزلہ زہر کے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گاؤں کے رہنے والے لوگ شہریوں کی نسبتاً عموماً طویل العمر اور تندرست ہیں۔ علی بخش نے کل مجھے بتایا کہ اس کی چچی کی لمبی عمر ہوئی اور آخر عمر میں اس کا گزران زیادہ تر لسی پر تھا۔ ترش لسی تو شاید آپ کے لیے مفید نہ ہو کہ آپ کا گلا خراب ہے۔ البتہ میٹھے دہی کی لسی اگر صبح پی جائے تو شاید مفید ہو۔ اس کا تجربہ بھی کرنا چاہیے۔ افسوس ہے کہ کوئی اچھا مکان رہنے کو نہیں ملتا۔ موجودہ مکان میں جوان لوگ تو بہ آسائش رہ سکتے ہیں، بوڑھوں کو تکلیف ہے ورنہ بڑی خواہش تھی کہ سال کا زیادہ حصہ آپ کے پاس بسر کیا کرتے۔ ذرا ریل کا انتظام ٹھیک ہو جائے تو ان شاء اللہ آپ کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوں گا۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے آپ کے دانت بنائے تھے اگر وہ خراب ہو گئے ہوں تو ان کو ڈاک میں بھیج دیجیے گا، پھر مرمت کروائے جائیں گے۔ اگر وہ قابلِ مرمت بھی نہ ہوں تو لکھیے ڈاکٹر عبداللطیف کو سیالکوٹ بھیج دوں گا کہ وہاں جا کر آپ کے دانت بنا دے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ گھر سے سب آپ کی خدمت میں آداب لکھواتی ہیں۔

روحانی کیفیات کا سب سے بڑا ممد و معاون یہی کھانے پینے کی چیزوں میں احتیاط ہے۔ نبی کریم ﷺ کی ساری زندگی اس بات کا ثبوت ہے۔ میں خود اپنی زندگی کم از کم کھانے پینے کے متعلق اسی طریق پر ڈھال رہا ہوں۔ دنیا کے حالات اور عام لوگوں کے حالات ایسے ہی ہیں ان کی طرف توجہ کرنا چاہیے عام لوگوں کی نگاہ بہت تنگ ہے۔ ان میں سے بیشتر حیوانوں کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اسی واسطے مولانا رومؒ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ چراغ لے کے تمام شہر میں پھرا کہ کوئی انسان نظر آئے گا مگر نظر نہ آیا اور موجودہ زمانہ تو روحانیت کے اعتبار سے بالکل تہی دست ہے۔ اسی واسطے اخلاص، محبت و مروت و یک جہتی کا نام و نشان نہیں رہا۔ آدمی آدمی کا خون پینے والا اور قوم قوم کی دشمن ہے۔ یہ دور انتہائی تاریکی کا ہے۔ لیکن تاریکی کا انجام سفید ہے۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ جلد اپنا فضل کرے اور بنی نوع انسان کو پھر ایک دفعہ نور محمدی ﷺ عطا کرے۔ بغیر کسی بڑی شخصیت کے اس دنیا کی نجات نظر نہیں آتی۔ زیادہ کیا عرض کروں خدا کا فضل ہے۔

غلام رسول بیمار تھا۔ کل میں نے اس کی خیریت دریافت کرنے کے لیے فیروز پور تار دیا تھا مگر تا حال جواب نہیں آیا۔ آج کل تار بھی دیر میں پہنچتے ہیں۔

مشق

۱۔ اقبالؒ نے کھانے پینے کے معاملے میں حضورﷺ کی کیا سنت بیان کی ہے؟

۲۔ اقبالؒ انجمن کے مستقر کے لیے لاہور کے انتخاب پر کیوں زور دیتے ہیں؟

۳۔ روحانیت کی کمی سے معاشرے پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

۴۔ درج ذیل جملوں کی وضاحت کریں۔

ا۔ ''عام مسلمانوں کی حالت اقتصادی اعتبار سے حوصلہ شکن ہے۔ اُمرا توجہ کریں تو کام بن سکتا ہے مگر افسوس کہ اکثر مسلمان اُمرا مقروض ہیں''۔

ب۔ ''یہ دور انتہائی تاریکی کا ہے۔ لیکن تاریکی کا انجام سفید ہے، کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اپنا فضل کرے۔''

ج۔ ''میری لسانی عصبیت، دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔''

د۔ ''وہ کہتا ہے کہ انسان کے جسم میں ایسے جراثیم ہیں جو قاطع حیات ہیں اور دہی کی لسی ان جراثیم کے لیے بمنزلہ زہر کے ہے۔''

سرگرمی:

علامہ محمد اقبال نے اور بھی خطوط لکھے ہیں۔ لائبریری میں سے تلاش کر کے کوئی ایک خط کاپی میں نقل کریں۔

Not For Sale

حصہ نظم

Not For Sale

ماہر القادری

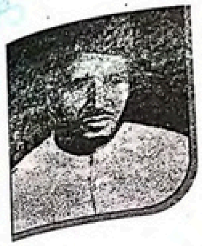

پیدائش: ۳۰ر جولائی ۱۹۰۶ء

وفات: ۱۲ر مئی ۱۹۷۸ء

منظور حسین نام اور ماہر تخلص تھا لیکن ماہر القادری کے نام سے شہرت پائی۔ اُتر پردیش کے ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم علی گڑھ سے حاصل کی۔ حیدر آباد دکن میں ان کی ادبی شہرت بامِ عروج پر تھی۔ پاکستان بننے پر کراچی آگئے۔ ہندوستان میں کچھ عرصہ روزنامہ [illegible] سے وابستہ رہے۔ ۱۹۴۹ء میں رسالہ [illegible] نکالا۔ جدّہ کے ایک مشاعرے میں حرکتِ قلب بند ہونے کے باعث انتقال کر گئے اور وصیت کے مطابق مکہ معظّمہ میں دفن کیے گئے۔

ماہر القادری نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی لیکن اُن کی اصل شہرت نعت گوئی کی وجہ سے ہے۔ اُن کی شاعری کی نمایاں خصوصیت سادگی اور بے تکلفی ہے۔ چونکہ اُن کی شاعری کا محور حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے، اس لیے موضوع کی مناسبت سے اُن کی زبان پاکیزہ اور شستہ ہے۔ اُن کا دِل عشقِ رسول ﷺ سے معمور تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی محبت ہی اصلِ ایمان ہے اور یہی عشق اُن کی نعتوں کا محور و مرکز ہے۔ اسی جذبے سے سرشار ہو کر جب آپ نعت لکھتے ہیں تو سماں بندھ جاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے یہی والہانہ محبت آپ کا سرمایۂ حیات ہے۔ آپ کا انتقال بھی مکہ مکرمہ میں ہوا اور وہاں کے مشہور قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔

[illegible] جذبات ماہر، ذکرِ جمیل وغیرہ

Not For Sale

حَمد

فکر و دانش کی ہے معراج خدا کا اِقرار
یہی وجدان کی آواز ہے، فطرت کی پکار

ذرّے ذرّے کی شہادت کہ خدا ہے موجود
پتّے پتّے کو ہے صانع کی صفت کا اِقرار

اُسی خلّاق نے جوہر کو توانائی دی
پھول پتّوں کو عطا جس نے کیے نقش و نگار

اُسی خالق ، اُسی مالک کی ہے سب حمد و ثنا
آبشاروں کا ترنم ہو کہ گلبانگِ ہزار

یہ سب آیاتِ الٰہی ہیں، ذرا غور سے۔ دیکھ
اُس کی پھر حمد بیاں کر، اُسی خالق کو پکار

اُس کی صنعت کے نمونے ہیں وہ نکہت ہو کہ رنگ
اُس کی قدرت کے کرشمے ہیں ، خزاں ہو کہ بہار

Not For Sale

مشق

۱۔ [illegible] ۔حمد کے اشعار کے پس منظر میں اس مصرعے کی وضاحت کریں۔

۲۔ اس حمد میں اللہ تعالیٰ کی جن صفات کا ذکر کیا گیا ہے، اُنھیں اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۳۔ حمد کی تعریف کریں۔ اس حمد کے علاوہ کوئی سے تین حمدیہ اشعار تحریر کریں۔

۴۔ قواعد کے حوالے سے جملے درست کریں۔

- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- جب میں لاہور پہنچ جاؤں گا تمھیں خط لکھوں گا۔
- میں نے درحقیقت میں اسے تمام صورت حال بتادی۔

۵۔ اس حمد کے قوافی لکھیں۔

۶۔ حمد کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

نظم:

۱۔ نظم کے لفظی معنی ہیں ''پرونا'' جیسے موتی لڑی میں پروئے جاتے ہیں۔ ادب کی رُو سے اشعار کے مجموعے کو نظم کہتے ہیں۔

۲۔ ''کسی ایک خیال یا موضوع کے تحت لکھے گئے اشعار کو نظم کہتے ہیں''۔

پابند نظم:

اس نظم میں وزن اور بحر کے ساتھ ساتھ قافیہ اور بسا اوقات ردیف کی پابندی بھی ضروری ہوتی ہے۔

Not For Sale

محسن کاکوروی

وفات: ۱۹۰۵ء

پیدائش: ۱۸۲۶ء

نام محمد محسن اور محسن ہی ان کا تخلص تھا۔ لکھنؤ کے ایک قصبے کاکوری میں پیدا ہوئے۔ علومِ متداولہ کے حصول کے بعد انگریزی تعلیم حاصل کی اور عدالتی کاموں میں مشغول ہو گئے۔ بعد ازاں وکالت کا امتحان پاس کیا اور آگرے میں پریکٹس کرتے رہے۔

روایت ہے کہ محسن نو سال کے تھے کہ اُنھیں خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی، جس پر اظہارِ مسرت کے طور پر اُنھوں نے ایک فارسی نظم لکھی۔ محسن کاکوروی کا زیادہ تر کلام حمدیہ اور نعتیہ ہے۔ ان کی وجۂ شہرت بھی ان کا نعتیہ کلام ہے۔ ان کا کلام ''کلیاتِ نعتِ محسن'' کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔

محسن کی شاعری مجموعی طور پر زبان دانی کا ایک عمدہ نمونہ ہے جس میں عربی فارسی کے علاوہ ہندی الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہیں۔ اُن کی نعتوں میں صداقت اور خلوص موجود ہے۔ اُن کا اسلوب شگفتہ اور رواں دواں ہے۔ دبستانِ لکھنؤ سے تعلق کی وجہ سے اُن کے ہاں شوکتِ الفاظ پائی جاتی ہے۔ اُن کی زبان کوثر و تسنیم میں دُھلی ہوئی ہے۔ بندشیں چست اور نادر و حسین تشبیہات اور استعارات نے اُن کے کلام کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ اِن کے ہاں الفاظ کا چناؤ اور مضمون کی بلندی ہمیشہ ہم آہنگ نظر آتی ہے اور یہ چیز ان کی قادر الکلامی کی دلیل ہے۔ نعتوں کے علاوہ ان کے مجموعہ کلیات میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے مناقب بھی موجود ہیں اور بعض دیگر اصناف پر بھی اشعار ملتے ہیں جن میں تاریخ گوئی بھی ملتی ہے۔

مجموعہ کلام: کلیاتِ نعتِ محسن

محسن کاکوروی

نعت

سب سے اعلیٰ تری سرکار ہے، سب سے افضل
میرے ایمان مفصّل کا یہی ہے مجمل

گلِ خوش رنگ رسولِ ﷺ مدنی و عربی
زیبِ دامانِ ابد، طرّۂ دستارِ ازل

اَوجِ رفعت کا قمر، نخلِ دو عالم کا ثمر
بحرِ وحدت کا گہر، چشمۂ کثرت کا کنول

ہے تمنا کہ رہے نعت سے تیرے خالی
نہ مرا شعر، نہ قطعہ، نہ قصیدہ ، نہ غزل

ہو مرا ریشۂ اُمّید، وہ نخلِ سر سبز
جس کی ہر شاخ میں ہو پھول، ہر اک پھول میں پھل

رخِ انور کا ترے دھیان رہے بعدِ فنا
میرے ہمراہ چلے راہِ عدم میں مشعل

صفِ محشر میں ترے ساتھ ہو تیرا مدّاح
ہاتھ میں ہو یہی مستانہ قصیدہ، یہ غزل

مشق

۱۔ حمد، نعت اور منقبت میں فرق واضح کریں۔
۲۔ شاعر نے رسول کریم ﷺ کے کیا کیا اوصاف بیان کیے ہیں؟ ان کی وضاحت کریں۔
۳۔ آخری تین اشعار میں کیا دعا کی گئی ہے۔
۴۔ اس نعت میں کون کون سی تشبیہات استعمال ہوئی ہیں؟
۵۔ اس نعت میں جن اصنافِ سخن کا ذکر ہوا ہے، ان کی تعریف کریں۔
۶۔ کلام میں ایک چیز کی مناسبت سے مختلف چیزوں کا ذکر کرنا جن میں کوئی تضاد نہ ہو مراعاۃ النظیر کہلاتا ہے۔ مثلاً

ہو مرا ریشۂ امید وہ نخلِ سرسبز
جس کی ہر شاخ میں ہو پھول، ہر اک پھول میں پھل

اس شعر کے پہلے مصرعے میں نخلِ سرسبز کی مناسبت سے شاخ، پھول اور پھل کا ذکر کیا گیا ہے۔ کم سے کم تین اشعار لکھیں جن میں صنعتِ مراعاۃ النظیر پائی جائے۔

طلبہ کمرۂ جماعت میں نعت خوانی کی مشق کریں۔

ہدایات برائے اساتذہ: ۱۔ طلبہ کو تشبیہ کے مفہوم اور ارکان سے آگاہ کریں۔
۲۔ طلبہ کو اُردو شاعری کی اصناف سے آگاہ کریں۔

نظیر اکبرآبادی

پیدائش: ۱۷۴۰ء

وفات: ۱۸۳۰ء

سید ولی محمد نظیر اکبرآبادی آگرے میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید محمد فاروق تھا۔ آگرے کے ایک مکتب میں عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ نظیر نے بڑے پُر آشوب زمانے میں ہوش سنبھالا۔ آگرے کے بُرے حالات نے اُنھیں ہجرت پر مجبور کیا اور وہ اپنی والدہ اور نانی کے ہمراہ دِلّی منتقل ہوگئے۔ دِلّی میں نظیر کا لڑکپن اور جوانی بڑی ہنسی خوشی اور رنگ رلیوں میں گزری۔ اُنھوں نے ہر قسم کی تقریبات اور تفریحات میں حصہ لیا۔ طبیعت موزوں تھی، اس لیے شاعری شروع کی۔

نظیر قناعت پسند، صوفی منش اور بے پرواطبیعت کے مالک تھے۔ ساری عمر معلّمی کا پیشہ اختیار کیے رکھا۔ کسی نواب یا بادشاہ کے دربار سے وابستہ نہ ہوئے۔ اَوَدھ اور بھرَت پور کے حکمرانوں نے دعوت نامے بھیجے مگر نظیر نے قبول نہ کیے۔ اُن کی شاعری محض تخیل کی شاعری نہیں بلکہ اُنھوں نے جو کچھ دیکھا وہی اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اُنھوں نے ایک طرف اپنی شاعریُ میں دِلّی کے میلوں ٹھیلوں، تفریحات، کھیل تماشوں اور مذہبی تقاریب کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا تو دوسری طرف اخلاقی مضامین اور تصوف پر بھی قلم اُٹھایا۔

اُن کی شاعری میں عوامی مسائل اور عوامی خیالات کی ترجمانی ملتی ہے۔ ایسی نظموں میں فکر آٹے دال کا، روپے کی فلاسفی، روٹی نامہ، آدمی نامہ اور مفلسی وغیرہ شامل ہیں۔

نظیر اکبرآبادی نظم میں ایک نئے طرز اور نئے انداز کے موجد تھے۔ وہ پُرگو شاعر تھے۔ اُن کی نظموں میں موسیقیت، روانی، جزیات نگاری اور منظر نگاری عروج پر ہے۔ مشکل اور ادق قافیے باندھنے میں اُنھیں کمال حاصل تھا۔ اُن کے کلام میں مذہبی رنگ موجود ہے۔ انبیائے کرامؑ اور بزرگانِ دینؒ سے عقیدت اُن کی شاعری میں موجود ہے۔ نظیر اکبرآبادی نے طویل عمر پائی۔ آخری عمر میں وہ فالج میں مبتلا ہو گئے اور اسی مرض میں وفات پائی۔

مجموعہ کلام: کلیاتِ نظیر اکبرآبادی

Not For Sale

شہر آشوب

ہے اب تو کچھ سخن کا مرے اختیار بند
رہتی ہے طبعِ سوچ میں لیل و نہار بند
دریا سخن کی فکر کا ہے موجدار بند
ہو کس طرح نہ منہ میں زباں بار بار بند
جب آگرے کی خَلق کا ہو روزگار بند

بے روزگاری نے یہ دکھائی ہے مفلسی
کوٹھے کی چھت نہیں ہے، یہ چھائی ہے مفلسی
دیوار و در کے بیچ سمائی ہے مفلسی
ہر گھر میں اس طرح سے بھر آئی ہے مفلسی
پانی کا ٹوٹ جاوے ہے جوں ایک بار بند

صراف، بنیے، جوہری اور سیٹھ ساہوکار
دیتے تھے سب کو نقد، سو کھاتے ہیں اب اُدھار
بازار میں اُڑے ہے پڑی خاک بے شمار
بیٹھے ہیں یوں دکانوں میں اپنے دکان دار
جیسے کہ چور بیٹھے ہوں قیدی قطار بند

محنت سے ہاتھ پاؤں کی کوڑی نہ ہاتھ آئے
بے کار کب تلک کوئی قرض اور اُدھار کھائے
دیکھوں جسے وہ کرتا ہے رو رو کے ہائے ہائے
آتا ہے ایسے حال پہ رونا ہمیں تو ہائے
دِشمن کا بھی خُدا نہ کرے کاروبار بند

Not For Sale

اس شہر کے فقیر بھکاری جو ہیں تباہ
جس گھر میں جا سوال وہ کرتے ہیں خواہ مخواہ
بھوکے ہیں کچھ بھجائیو بابا خُدا کی راہ
واں سے صدا یہ آتی ہے: ''پھر مانگو'' جب تو آہ
کرتے ہیں ہونٹ اپنے وہ ہو شرم سار بند

کیا چھوٹے کام والے وکیا پیشہ ور نجیب
روزی کے آج ہاتھ سے عاجز ہیں سب غریب
ہوتی ہے بیٹھے بیٹھے جب آ شام عنقریب
اُٹھتے ہیں سب دُکان سے کہہ کر کہ یا نصیب
قسمت ہماری ہوگئی بے اختیار بند

ہے کون سا وہ دِل جسے فرسُودگی نہیں
وہ گھر نہیں کہ روزی کی نابُودگی نہیں
ہر گز کسی کے حال میں بہبودگی نہیں
اب آگرے کے نام کو آسودگی نہیں
کوڑی کے آکے ایسے ہوئے رہ گزار بند

ہے میری حق سے اب یہ دُعا شام اور سحر
ہو آگرے کی خلق پہ پھر مہر کی نظر
سب کھاویں پیویں یاد رکھیں اپنے اپنے گھر
اِس ٹوٹے شہر پر بھی اِلٰہی تُو فضل کر
کُھل جاویں ایک بار تو سب کاروبار بند

(کلیاتِ نظیر اکبر آبادی)

مشق

۱۔ اس نظم کا مرکزی خیال اپنے الفاظ میں لکھیں۔
۲۔ اس نظم میں کِن کِن پیشوں کا ذکر کیا گیا ہے؟ ان کی وضاحت کریں۔
۳۔ شہر آشوب کی تعریف کریں۔ کسی اور شاعر کے شہر آشوب کے چند اشعار لکھیں۔
۴۔ ''پھر مانگو'' سے کیا مُراد ہے؟
۵۔ شاعر نے گھر کی مفلسی کا کیا نقشہ کھینچا ہے؟
۶۔ ''جیسے کہ چور بیٹھے ہوں قیدی قطار بند'' اس مصرعے میں تشبیہ پائی جاتی ہے۔ تشبیہ کی تعریف کریں اور اشعار میں مثالیں دیں۔
۷۔ یہ نظم کس ہیئت میں ہے؟ وضاحت کریں۔

ہدایات برائے اساتذہ:

ہیئت کی وضاحت کریں اور مختلف ہیئتوں میں لکھی گئی نظموں کی مثالیں دیں۔

میر حسن

پیدائش: ۱۷۲۷ء

وفات: ۱۷۸۶ء

نام میر غلام حسن اور حسنؔ تخلص ہے۔ وہ نامور ہجو گو میر ضاحکؔ کے بیٹے، میر خلیقؔ کے والد اور مشہور مرثیہ نگار میر انیسؔ کے دادا تھے۔ دِلّی کے سیّدواڑا میں پیدا ہوئے۔ تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ دلّی کا شہر جو کئی بار اُجڑا، ان کے زمانے میں بھی ویران ہو گیا، تو وہ اپنے والد کے ساتھ فیض آباد چلے گئے جو اس زمانے میں اودھ کا دارالحکومت تھا۔ یہاں وہ نواب سالار جنگ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ جب نواب آصف الدولہ نے اپنا دارالحکومت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کیا تو یہ بھی لکھنؤ آ گئے۔

شعر و شاعری کا ملکہ اُن کو ورثے میں مِلا۔ صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ اُن کی شہرت غزلیات یا قصائد سے نہیں، بلکہ صرف مثنوی ''سحرالبیان'' کی وجہ سے ہے۔ ایک روایتی داستان جو دراصل شہزادہ بے نظیر اور شہزادی بدرِ مُنیر کا افسانۂ عشق ہے لیکن میر حسنؔ نے اپنے اندازِ بیان سے اِسے واقعیت اور حقیقت کا رنگ دے دیا۔ واقعہ نگاری، کردار نگاری اور منظر کشی کے ساتھ انھوں نے اپنے زمانے کے رسم و رواج اور تمدن کی تصویر کشی بھی کی ہے۔

میر حسنؔ کے کلام میں ان کی یادگار غزلیات و قصائد کا ایک دیوان، مثنویات کا ایک مجموعہ اور شاعروں کا ایک تذکرہ شامل ہے۔

شہزادے کا چھت پر سونا اور پَری کے ہاتھوں اغوا ہونا

قضا را وہ شب تھی شبِ چار دہ
پڑا جلوہ لیتا تھا ہر طرف مہ

نظارے سے تھا اُس کے دل کو سُرور
عجب عالَم نور کا تھا ظہور

عجب لُطف تھا سیرِ مہتاب کا
کہے تو کہ دریا تھا مہتاب کا

ہُوا شاہ زادے کا دِل بے قرار
یہ دیکھی جو واں چاندنی کی بہار

کچھ آئی جو اُس مہ کے جی میں ترنگ
کہا: آج کوٹھے پہ بچھے پلنگ

کہا شہ نے اب تو گئے دِن نکل
اگر یوں ہے مرضی، تو کیا ہے خلل

قضا راہ وہ دِن تھا اُسی سال کا
غلط وہم ماضی میں تھا حال کا

سخن مولوی کا یہ سچ ہے قدیم
کہ آگے قضا کے، ہو احمق حکیم

وہ سونے کا جو تھا جڑاؤ پلنگ
کہ سیمیں تنوں کو ہو جس پر اُمنگ

کھنچی چادر ایک اس پہ شبنم کی صاف
کہ ہو چاندنی، جس صفا کی غلاف

دھرے اُس پہ تکیے کئی نرم نرم
کہ مخمل کو ہو جس کے دیکھے سے شرم

کبھی نیند میں جب کہ ہوتا تھا وہ
تو رخسار رکھ اُس پہ سوتا تھا وہ

چھپائے سے ہوتا نہ، حُسن اُس کا ماند
دیے تھے لگا اُس کے مکھڑے کو چاند

وہ سویا جو اِس آن سے بے نظیر
رہا پاسباں اُس کا بدرِ منیر

ہُوا اُس کے سونے پہ عاشق جو ماہ
لگا دی اُدھر اُس نے اپنی نگاہ

وہ مہ اُس کے کوٹھے کا ہالہ ہوا
غرض واں کا عالم دوبالا ہُوا

وہ پھولوں کی خوشبو ، وہ ستھرا پلنگ
جوانی کی نیند اور وہ سونے کا ڈھنگ

جہاں تک کہ چوکی کے تھے باری دار
ہُوا جو چلی ، سو گئے ایک بار

غرض سب کو واں عالمِ خواب تھا — فقط جاگتا ایک مہتاب تھا
قضا را ہوا اک پری کا گزر — پڑی شاہ زادے پہ اُس کی نظر
ہوئی حسن پر اُس کے جی سے نثار — وہ تخت اپنا لائی ہوا سے اُتار
جو دیکھا، تو عالم عجب ہے یہاں — منور ہے سارا زمیں آسماں
ہوئی دونوں کے حُسن کی ایک جوت — کہ جیسے ہو دو چشموں کی ایک سوت
مے عشق میں پھر یہ سوجھی ترنگ — کہ لے چلیے اس کا امانت پلنگ
محبت کی آئی جو دل میں ہوا — وہاں سے اُسے لے اُڑی دِل رُبا
غرض لے گئی آن کی آن میں — اُڑا کر وہ اُس کو پرستان میں
کبھی دِل رہے خوش کبھی درد مند — زمانے کی جب سے ہے پست و بلند

(مثنوی ''سحر البیان'')

مشق

۱۔ چاندنی رات کا منظر اپنے الفاظ میں لکھیں۔
۲۔ مصرعے کی وضاحت کریں۔
۳۔ مثنوی کی تعریف کریں۔
۴۔ درج ذیل الفاظ و محاورات کو جملوں میں استعمال کریں۔
۵۔ اس نظم سے دو اشعار لکھیں جن میں تشبیہ استعمال ہوئی ہو۔
۶۔ اس شعر میں خوش، درد مند اور پست و بلند متضاد الفاظ ہیں، اس طرح کے متضاد الفاظ سے کلام میں اثر اور معنی آفرینی پیدا ہوتی ہے۔ اسے صنعت تضاد کہتے ہیں۔ آپ ایسے تین اشعار لکھیں جن میں صنعتِ تضاد پائی جاتی ہو۔

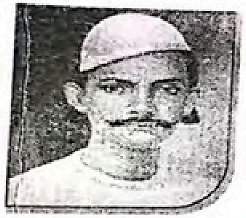

میر ببر علی انیسؔ

پیدائش: ۱۸۰۰ء — وفات: ۱۸۷۴ء

میر ببر علی انیس میر خلیقؔ کے فرزند اور میر حسنؔ کے پوتے تھے۔ خاندانی روایات کے مطابق انھیں گھر پر ہی تعلیم دی جاتی رہی۔ گھر کے باہر اُن کے پہلے استاد میر نجف علی فیض آبادی تھے۔ زمانہ طالب علمی میں انیسؔ کو معقولات اور لسانی مسائل سے بڑی دلچسپی تھی۔ ان کے ذاتی کتب خانے میں لگ بھگ دو ہزار کے قریب نسخے تھے۔ زمانے کے رواج کے مطابق انھوں نے شہ سواری اور شمشیر زنی بھی سیکھی۔ بعد میں فوجی تربیت بھی حاصل کی۔ ہمیشہ چاق و چوبند رہا کرتے تھے۔ طبعاً خوش مزاج اور حاضر جواب تھے۔

انیس نے شاعری کا آغاز غزل سے کیا لیکن ان کی شہرت کا مدار مرثیہ نگاری پر ہے۔ ان کے زمانے میں مرثیہ خوانی کے لیے تحت اللفظ اور سوز کا انداز اپنایا جاتا تھا۔ انیس نے دونوں طرح پڑھنے کے لیے مرثیے لکھے اور کامیاب رہے۔ اُن کا اسلوب سادہ، رواں اور آسان ہے۔ انسانی جذبات کا بیان انھوں نے جس طرح کیا ہے، شاید ہی کوئی کر سکے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ان کے مرثیوں کی تعداد دو ہزار کے قریب ہے۔

میر انیس کے مرثیے پانچ جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اُنھوں نے مرثیوں کے علاوہ سلام اور رباعیات بھی کہی ہیں۔ ان رباعیات میں بھی ان کا رنگ صوفیانہ ہے۔ مگر اُن کا کمال مرثیے کے فن میں زیادہ کھل کر سامنے آتا ہے۔

مجموعۂ کلام: کلیاتِ میر انیسؔ

دُرِّ مراد

جب کربلا میں داخلۂ شاہِ دیں ہُوا
دشتِ بلا نمونۂ خُلدِ بریں ہُوا
سر جھک گیا فلک کا، یہ اَوجِ زمیں ہُوا
خورشید محوِ حُسنِ حسینؑ حسیں ہُوا
پایا فروغ نیّرِ دیں کے ظہور سے
جنگل کو چاند لگ گئے چہرے کے نور سے

خوشبو سے اُن گلوں کی ہُوا دشت باغ باغ
غنچے کھلے، ہرے ہوئے بلبل کے دل کے داغ
پہنچا سرِ فلک پہ ہر اک کوہ کا دماغ
دریا نے بھی حبابوں کے روشن کیے چراغ
خورشید بن گئے طبقے ارضِ پاک کے
تاروں کو گرد کر دیا ذروں نے خاک کے

بولے فَرَس کو روک کے شاہِ فلک وقار
منزل پہ ہم پہنچ گئے، احسانِ کردگار
آگے نہ اب بڑھائے کوئی یاں سے راہوار
یہ وہ زمیں تھی، جس کے لیے دل تھا بے قرار

قربان اس مکانِ سعادت نشان کے
پایا دُرِ مراد بڑی خاک چھان کے

اُترو مسافرو! کہ سفر ہو چکا تمام
کُوچ اب نہ ہوگا حشر تلک، ہے یہیں مقام
مقتل یہی زمیں ہے، یہی مشہدِ امام
اُونٹوں سے بار اُتار کے برپا کرو خیام
بستر لگاؤ شوق سے، اس ارضِ پاک پر
چھڑکا ہوا ہے آبِ بقا یاں کی خاک پر

توشہ مسافروں کا یہی، اور یہی ہے زاد
یہ خاک آبِ خضر سے رتبے میں ہے زیاد
طوفاں میں اس کو ڈالے گا جو مردِ خوش نہاد
لے آئے گی ہوائے موافق دُرِ مُراد
دیکھے گا پاس میں کرمِ کارساز کو
تھامے گا دستِ موج سے دریا جہاز کو

اُترا یہ کہہ کے کشتیِ اُمت کا ناخدا
جتنے سوار تھے وہ ہوئے سب پیادہ پا
حضرتؑ نے مسکرا کے یہ ہر ایک سے کہا:
دیکھو تو! کیا ترائی ہے، کیا نہر، کیا فضا
اکبرؑ شگفتہ ہو گئے صحرا کو دیکھ کر
عباسؑ جھومنے لگے دریا کو دیکھ کر

بولے یہ اشک بحر کے شہنشاہِ سربلند
کیوں، یہ مقام ہے تمھیں شاید بہت پسند؟
کی مسکرا کے عرض کہ یا شاہِ ارجمند!
بس یاں تو خود بخود ہوئی جاتی ہے آنکھ بند
شیر اب یہیں رہیں گے عنایت جو رب کی ہے
یہ کیا کہوں حضور! ترائی غضب کی ہے

مشق

۱۔ مرثیہ کسے کہتے ہیں؟

۲۔ شاہِ دیں، کشتیِ امت کا ناخدا، شہنشاہِ سربلند ان تمام تراکیب سے کون سی ہستی مراد ہے؟

۳۔ [illegible] اس مصرعے کی وضاحت کریں۔

۴۔ اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ مفہوم واضح ہو جائے۔

[illegible] آبِ بقا۔ ناخدا۔ عنایت۔ پیادہ پا۔

۵۔ دوسرا مصرع بیان کریں۔

[illegible] (ب) [illegible] اس ارضِ پاک پر [illegible]

۶۔ کلام میں کسی بات کی کوئی ایسی وجہ بیان کرنا جو درحقیقت اس کی وجہ نہ ہو، لیکن کلام میں خوبصورتی پیدا کرتی ہو [illegible] کہلاتی ہے۔ مثلاً [illegible] کے پہلے بند میں فلک کے سر جھکانے کی وجہ شاہِ دیں کے کربلا میں داخل ہونے کو قرار دیا گیا ہے جو فلک کے جھکنے کی اصل وجہ نہیں ہے۔ آپ حسنِ تعلیل کی دو مثالیں پیش کریں۔

مرزا سلامت علی دبیرؔ

پیدائش: ۱۸۰۳ء | وفات: ۹ مارچ ۱۸۷۵ء

مرزا سلامت علی دبیرؔ دلّی میں پیدا ہوئے۔ سات برس کے تھے جب ان کے والدین دہلی سے لکھنو چلے آئے اور یہاں مستقل سکونت اختیار کی۔ مرزا دبیرؔ نے مُرَوّجہ علوم کی تحصیل کا سلسلہ یہاں سے شروع کیا۔ عربی اور فارسی یہاں کے جیّد علما سے پڑھی۔

فنِ شاعری میں مرزا دبیرؔ، میر ضمیرؔ کے شاگرد ہوئے۔ مرزا دبیرؔ نہایت سلیم الطبع اور عالی ظرف انسان تھے۔ اپنے ہم عصر مرثیہ گو انیس سے شاعرانہ چشمک کے باوجود کبھی نازیبا جملہ منھ سے نہیں نکالا۔

مرزا دبیرؔ کے مرثیے اپنی گھن گرج، آب و تاب اور زبان و بیان کے اعتبار سے خاصے کی چیز ہیں۔ اندازِ بیان کا رعب و دبدبہ، لکھنوی اثرات، منظر نگاری، لفظی صنعت گری، واقعہ نگاری، بے ساختہ پن، حسنِ تشبیہ اور سراپا نگاری وغیرہ اُن کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

مرزا دبیرؔ میر انیسؔ کے ہم عصر تھے۔ مگر یہ بات مسلّمہ ہے کہ مرزا دبیر مرثیہ گوئی کے میدان میں انیس سے پہلے داخل ہوئے۔ میر انیسؔ کے کلام کا شہرہ ہو جانے کے باوجود ان کے کمالات کا ہمیشہ اعتراف کیا جاتا رہا۔

مجموعۂ کلام: مراثیِ دبیرؔ

تختِ فَرس پہ علی اکبرؑ کا خطاب

شہزادے نے جلوہ جو کیا دامنِ زیں پر
پھر زین نے آوازہ کسا مہرِ مبیں پر
مَرکب نے قدم فخر سے رکھا نہ زمیں پر
سرعت سے کہا فرش بچھا عرشِ بریں پر
پلکوں سے لیا پنجے میں شہبازِ قضا کو
بغلوں کے شکنجے میں کیا قید ہوا کو

اک عالمِ حیرت تھا، چہ لاہوت، چہ ناسوت
سب جرم سے تائب تھے چہ ہاروت، چہ ماروت
سب خوف سے تھے زرد چہ خورشید، چہ یاقوت
سکتہ تھا سلاطین کو، نے تخت، نہ تابوت
بے خود جو کیا رُوئے درخشاں کی چمک نے
بالائے زمیں ٹیک دیے ہاتھ فلک نے

رہوار کے کاووں سے زمیں چرخ میں آئی
پر عرق عرق ہوگیا وہ حق کا فدائی
چہرے پہ عجب آب پسینے نے دکھائی
ان قطروں سے نیساں پہ گھٹا شرم کی چھائی

یہ قدر عرق کی نہ کسی رو سے بڑھی تھی
شبنم کبھی خورشید کے منہ پر نہ پڑی تھی

ماتھے کا عرق پاک کیا انگلی سے بارے
سورج سے کیے دُور مہِ نو نے ستارے
حیدؑر کے لب و لہجے میں لشکر کو پکارے
ہاں غافلو! آگاہ ہو رُتبے سے ہمارے
اللہ کے بندے ہیں پہ اللہ نہیں ہیں
بندے مگر اس طرح کے واللہ نہیں ہیں

تن پر رہِ معبود میں ہم سر نہیں رکھتے
ہم سر کے کٹا دینے میں ہمسر نہیں رکھتے
جز دستِ گدا اور کہیں زر نہیں رکھتے
تکیہ کرمِ حق پہ ہے، بستر نہیں رکھتے
یہ اُن پہ کھلا ہے کہ جو خاصانِ خدا ہیں
ہر بندے کے ہم بند کُشا عقد کُشا ہیں

احکامِ یزید اور ہیں اور اپنے امور اور
باطل کی نمود اور ہے اور حق کا ظہور اور
نمرود کی آگ اور ہے اور آتشِ طُور اور
زنبور کا غُل اور ہے الحانِ زبُور اور
سمجھو تو سہی تم کہ بشر کیا، ہیں مَلَکُ کیا
بُت کیا ہے، خدا کیا ہے، زمیں کیا ہے، فلک کیا

سامان سے کوئی صاحبِ ایمان نہیں ہوتا
ہر اہلِ عصا موسیٰ عمراں نہیں ہوتا

پہنے جو انگوٹھی وہ سلیمان نہیں ہوتا
آئینہ گرِ اسکندرِ دوراں نہیں ہوتا

لاکھ اَوج ہو پشّے کا ، ہُما ہو نہیں جاتا
بُت سجدۂ کافر سے خدا ہو نہیں جاتا

(مراثیِ دبیر)

مشق

۱۔ حضرت علی اکبرؑ نے اپنے خطاب میں کیا ارشاد فرمایا؟

۲۔ اس نظم میں جن تاریخی شخصیات کا ذکر ہوا ہے، ان کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

۳۔ نظم سے ایسے مصرعے تلاش کر کے لکھیں جن میں صنعتِ تضاد کا استعمال ہو۔

۴۔ مرثیہ کی تعریف کریں اور مرثیے کے ارکان کی وضاحت کریں۔

۵۔ کسی اور مرثیے کے تین اشعار لکھیں، جن کا موضوع واقعاتِ کربلا ہو۔

ہدایت برائے اساتذہ: طلبہ کو واقعۂ کربلا کے بارے میں مستند معلومات فراہم کریں۔

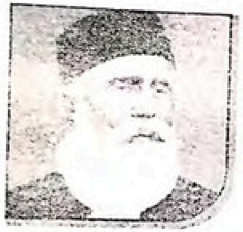

الطاف حسین حالیؔ

پیدائش: ۱۸۳۷ء | وفات: ۱۹۱۴ء

الطاف حسین حالیؔ پانی پت میں پیدا ہوئے۔ باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کر سکے، تاہم ذاتی کوشش سے عربی اور فارسی میں مہارت حاصل کی۔ حصولِ تعلیم کے شوق میں دلّی گئے، جہاں غالبؔ اور شیفتہ سے ملاقاتیں ہوئی۔ چند سال شیفتہ کے مصاحب رہے۔ ۱۸۷۴ء میں لاہور میں ملازمت مل گئی اور انگریزی سے ترجمہ ہونے والی کتابوں پر نظرثانی کرتے رہے۔ یہاں جدید نظم کے چار مشاعروں میں شریک ہوئے۔ پھر اینگلو عریبک سکول دلّی میں مدرس ہو گئے۔ وہاں سرسید اور ان کی تحریک سے رابطہ ہوا۔ سرسید کے ایما پر مسدس ''مدوجزرِ اسلام'' لکھی۔ اس کے بعد بہت سی نظمیں لکھیں اور کئی جدید نظم نگار شعراء کو متاثر کیا۔ مولانا حالی اور آزاد دونوں کی مشترکہ کوششوں سے اُردو شاعری بہت حد تک تبدیل ہو گئی اور اس میں پہلی بار مشرقی خیالات کے ساتھ ساتھ مغربی خیالات بھی سامنے آئے۔ حالیؔ نے غزل کو بھی جدید رنگ میں ڈھالا اور روایت کی بے جا تقلید کے بجائے تازگیِ بیان پر توجہ دی۔ حالیؔ کی غزل میں میرؔ و غالبؔ کا سا تغزل ملتا ہے جب کہ اُن کی نظمیں جذبہ حُب اُلوطنی اور اصلاحِ ملّت کا ثبوت ہیں۔ اُردو شاعری میں پہلی مرتبہ حالیؔ نے قومی، سیاسی اور سماجی موضوعات پر طبع آزمائی کی۔ حب الوطن، چُپ کی داد، نشاطِ اُمید اور مناظرہ رحم انصاف جیسی نظمیں اس کی درخشندہ مثالیں ہیں۔ حالیؔ نے پانی پت میں وفات پائی۔

تصانیف: مقدمہ شعروشاعری، حیاتِ جاوید، حیاتِ سعدیؒ وغیرہ۔

اُمید

بس اے نا امیدی نہ یوں دل بجھا تو
جھلک اے امید اپنی آخر دکھا تو
ذرا نااُمیدوں کی ڈھارس بندھا تو
فسُردہ دلوں کے دل آکر بڑھا تو
ترے دم سے مُردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تو نے سرسبز کی ہیں

سفینہ بے نوحؑ طوفاں میں تو تھی
سکوں بخشِ یعقوبؑ کنعاں میں تو تھی
زلیخا کی غمخوار ہجراں میں تو تھی
دلِ آرام یوسفؑ کی زنداں میں تو تھی
مصائب نے جب آن کر اُن کو گھیرا
سہارا وہاں سب کو تھا ایک تیرا

بہت ڈوبتوں کو ترایا ہے تو نے
بگڑتوں کو اکثر بنایا ہے تو نے
اُکھڑتے دلوں کو جمایا ہے تو نے
اُجڑتے گھروں کو بسایا ہے تو نے

بہت تو نے پستوں کو بالا کیا ہے
اندھیرے میں اکثر اُجالا کیا ہے

قوی تجھ سے ہمت ہے پیر و جواں کی
بندھی تجھ سے ڈھارس ہے خُرد و کلاں کی
تجھی پر ہے بنیاد نُظمِ جہاں کی
نہ ہو تو تو رونق نہ ہو اس دکاں کی
تگاپو ہے ہر مرحلے میں تجھی سے
روارو ہے ہر قافلے میں تجھی سے

نوازا بہت بے نواؤں کو تو نے
تونگر بنایا گداؤں کو تو نے
دیا دسترس نارساؤں کو تو نے
کیا بادشہ ناخداؤں کو تو نے
سکندر کو شانِ کئی تو نے بخشی
کلمبس کو دنیا نئی تو نے بخشی

وہ رہرو نہیں رکھتے جو کوئی ساماں
خور و زاد سے جن کا خالی ہے داماں
نہ ساتھی کوئی جس سے منزل ہو آساں
نہ محرم کوئی جو سُنے دردِ پنہاں
ترے بل پہ خوش خوش ہیں اس طرح جاتے
کہ جا کر خزانے ہیں اب کوئی پاتے

زمیں جوتنے کو جب اُٹھتا ہے جوتا
سمیں کا گماں تک نہیں جب کہ ہوتا
شب و روز محنت میں ہے جان کھوتا
مہینوں نہیں پاؤں پھیلا کے سوتا

ار موجزن اُس کے دل میں نہ تو ہو
تو دنیا میں غُل بھوک کا چار سو ہو

بنے اس سے بھی گر ہوا اپنے دم پر
بلاؤں کا ہو سامنا ہر قدم پر
پہاڑ اک فزوں اور ہو کوہ غم پر
گزرنی ہو جو کچھ گزر جائے ہم پر

نہیں فکر، تو دل بڑھاتی ہے جب تک
دماغوں میں بُو تیری آتی ہے جب تک

(مسدس مدو جزر اسلام)

مشق

۱۔ جس نظم کے ہر بند میں چھے مصرے ہوں اسے مسدس کہتے ہیں۔ آپ کی کتاب میں کون کون سی ایسی نظمیں شامل ہیں جو مسدس کی ہیت میں لکھی گئی ہیں؟
۲۔ دوسرے بند کی وضاحت تاریخی حقائق کی روشنی میں کریں۔
۳۔ نظم ''اُمید'' کا خلاصہ لکھیں۔
۳۔ نظم میں جو الفاظ ایک دوسرے کے متضاد استعمال ہوئے ہیں، ان کی نشاندہی کریں۔
۴۔ تلمیح کی تعریف کریں اور اس نظم سے تلمیحات چن کر ان کی وضاحت کریں۔
۵۔ مجازِ مرسل کی تعریف کریں اور مثالیں دیں۔

اکبرالہ آبادی

پیدائش: ۱۸۴۵ء
وفات: ۱۹۲۱ء

اصل نام سید اکبر حُسین اور اکبر ہی تخلص تھا۔ الٰہ آباد میں میں ولادت ہوئی۔ رسمی تعلیم بہت کم تھی۔ ذاتی کوشش سے وکالت کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۸۰ء میں ''جوڈیشنل سروس'' کے لیے منتخب ہوئے۔ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے عہدے تک پہنچے۔ اُن کا شمار اردو کے نامور شعرا میں ہوتا ہے۔ اُن کی شاعری امتیازی اور انفرادی خصوصیات کی حامل ہے اور ان کی مقبولیت کا دار و مدار ان کی طنزیہ اور ظریفانہ شاعری پر ہے۔

اکبر نے اپنی شاعری کا آغاز سنجیدہ کلام سے کیا تھا لیکن جلد ہی اُنھوں نے ایک پیامی شاعر کا منصب اختیار کیا۔ انگریز جو تہذیب اپنے ساتھ لائے تھے، وہ اکبر کو سخت ناپسند تھی۔ چنانچہ قدیم تہذیب کی حمایت اور جدید تہذیب کی مخالفت ان کی زندگی کا نصب العین رہا۔ اکبر بہت بے خوف آدمی تھے۔ سرکاری ملازم ہونے کے باوجود انگریزی تہذیب وتمدن پر سخت تنقید کرتے رہے۔ اس سلسلے میں آنے والی مشکلات کا اندازہ لگاتے ہوئے اُنھوں نے طنز اور ظرافت کا انداز اختیار کیا۔ اُن کے انداز اور اسلوب نے ایسی عالمگیر شہرت اختیار کی کہ آج بھی لوگ اُنھیں ''لِسان العصر'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اکبرالہ آبادی نے ۱۹۲۱ء میں الٰہ آباد میں وفات پائی۔

مجموعۂ کلام: کلیاتِ اکبر

اکبرالہ آبادی

نصیحتِ اخلاق

بیٹے کو لوگ کہتے ہیں، آنکھوں کا نور ہے — ہے زندگی کا لطف، تو دل کا سُرور ہے
گھر میں اسی کے دم سے ہے ہر سمت روشنی — نازاں ہے اس پہ باپ، تو ماں کو غرور ہے
خوش قسمتی کی اس کو نشانی سمجھتے ہیں — کہتے ہیں یہ خدا کے کرم کا ظہور ہے
اکبر بھی اس خیال سے کرتا ہے اتفاق — اس کا بھی ہے یہ قول، کہ ایسا ضرور ہے
البتہ شرط یہ ہے، کہ بیٹا ہے ہونہار — مائل ہے نیکیوں پہ، برائی سے دور ہے
سنتا ہے دل لگا کے بزرگوں کی پند کو — وقتِ کلام لب پہ جناب و حضور ہے
برتاؤ اس کا صدق و محبت سے ہے بھرا — اس میں نہ ہے فریب نہ ہے مکر و زور ہے
افکار والدین میں ہے دل سے وہ شریک — ہمدرد ہے معین ہے اہل شعور ہے
راضی ہے اس پہ باپ کی جو کچھ ہو مصلحت — صابر ہے باادب ہے عقیل و غیور ہے
رکھتا ہے خاندان کی عزت کا وہ خیال — نیکوں کا دوست صحبت بد سے نفور ہے
کسبِ کمال کی ہے شب و روز اس کو دھن — علم و ہنر کے شوق کا دل میں وفور ہے
لیکن جو اِن صفات کا مطلق نہیں پتا — اور پھر بھی ہے خوشی تو خوشی کا قصور ہے

(کلیاتِ اکبر حصہ اول)

مشق

۱۔ اس نظم میں اکبرالہ آبادی نے ہونہار بیٹے کی کیا خصوصیات بتائی ہیں؟
۲۔ نظم ''نصیحتِ اخلاق'' کا خلاصہ لکھیں۔
۳۔ درج ذیل الفاظ و محاورات کے معنی لکھیں اور جملوں میں استعمال کریں۔
نازاں، ظہور، مکر و زور، کسب کمال، اہل شعور۔
۴۔ اس نظم کا مرکزی خیال تحریر کریں۔
۵۔ اس نظم کے قوافی لکھیں۔

ہدایت برائے اساتذہ:
طلبہ کو طنز و مزاح کی تعریف بتائیں نیز دونوں کے فرق اور اہمیت سے روشناس کریں۔

حفیظ جالندھری

پیدائش: ۱۹۰۰ء

وفات: ۱۹۸۲ء

محمد حفیظ نام اور حفیظ ہی تخلص تھا۔ جالندھر میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حافظ شمس الدین تھا۔ اُن کے اُستاد اُنھیں ابوالاثر حفیظ کہتے تھے اور وہ اسی نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم جالندھر ہی میں ہوئی۔ وہ خاندانی حالات اور خانگی ذمہ داریوں کی وجہ سے اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ وہ بائیس سال کی عمر میں جالندھر سے لاہور آئے۔ یہاں کی ادبی فضا میں ان کے ادبی جوہر خوب کھلے اور جلد ہی وہ اپنے دور کے ممتاز شعرا میں شمار ہونے لگے۔

اُنھوں نے پاکستان کا قومی ترانہ اور اسلام کی منظوم تاریخ ''شاہنامۂ اسلام'' کے عنوان سے رقم کی۔ ان دونوں تخلیقات نے اُنھیں زندۂ جاوید بنا دیا۔

حفیظ بنیادی طور پر گیت نگار ہیں۔ اُن کے گیت جذبات اور لطافت سے بھرپور ہیں۔ وہ عام طور پر چھوٹی اور مترنم بحریں استعمال کرتے ہیں۔ اُن کی شاعری کی خصوصیت غنایت اور شگفتگی ہے۔ اُن کی شاعری میں ہندی الفاظ کا بے تکلفانہ انداز، ان کے کلام میں مٹھاس پیدا کر دیتا ہے۔ انھوں نے نظموں میں قابلِ قدر تجربے بھی کیے۔ سادگی، دلکشی، موسیقیت، تغزل، منظر کشی، ندرتِ تشبیہات، مقصدیت اور متنوع بحروں کا استعمال ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

تصانیف: سوز و ساز، تلخابۂ شیریں، تصویرِ کشمیر، بہار کے پھول، نغمہ زار، حفیظ کے گیت، حفیظ کی نظمیں اور چیونٹی نامہ۔

جلوۂ سحر

چلا ستارۂ سَحر سنا کے صبح کی خبر
زمیں پہ نور چھا گیا فلک پہ رنگ آگیا
تمام زادگانِ شب چمک چمک کے سو گئے
شرارِ آسمانِ شب دمک دمک کے سوگئے
ستارے زرد ہو چکے چراغ سرد ہو چکے
وہ ٹمٹما کے رہ گئے یہ جھلملا کے رہ گئے
چلا ستارۂ سحر سنا کے صبح کی خبر

☆

یکا یک ایک نور کا غبار شرق سے اٹھا
وہ رفتہ رفتہ بڑھ چلا اور آسماں پہ چھا گیا
حسینۂ نمود نے سیَہ نقاب اٹھا دیا
فسُوں گرِ شُہُودِ نے طِلسمِ شب مٹا دیا
یکا یک ایک تازگی یکا یک ایک روشنی
نگاہِ جاں میں آگئی حیات میں سما گئی
یکا یک ایک نور کا غبار شرق سے اٹھا

☆

عبادتوں کے در کھلے — سعادتوں کے در کھلے
درِ قبول وا ہوا — دُعا کا وقت آگیا
اذان کی صدا اٹھی — جگا دیا نماز کو
چلی ہے اٹھ کے بندگی — لیے ہوئے نیاز کو
صنم کدہ بھی کھل گیا — اُٹھا ہے شور سنکھ کا
چلو نمازیو! چلو — اُٹھو پجاریو! اُٹھو
عبادتوں کے در کھلے — سعادتوں کے در کھلے

کسان اٹھ کھڑے ہوئے — مویشیوں کو لے چلے
کہیں مزے میں آگئے — تو کوئی تان اڑا گئے
یہ سرد شبنمی ہوا — یہ صحت آفریں سماں
یہ فرش سبز گھاس کا — یہ دل فریب آسماں
بسے ہوئے پریت میں — ہیں محو ان کے گیت میں
کہاں ہیں شہر کے مکیں — وہ بے نصیب اُٹھے نہیں
کسان اٹھ کھڑے ہوئے — مویشیوں کو لے چلے

اٹھی حسینۂ سحر — پہن کے سر پہ تاجِ زر
لباسِ نور زیب بر — چڑھی فرازِ کوہ پر
وہ خندۂ نگاہ سے — پہاڑ طُور بن گئے
وہ عکسِ جلوہ گاہ سے — سحاب نور بن گئے
نوائے جوئبار اُٹھی — صدائے آبشار اُٹھی
ہواؤں کے رباب اُٹھے — خوش آمدید کے لیے
اٹھی حسینۂ سحر — پہن کے سر پہ تاجِ زر

(سرمایۂ اُردو، انتخاب از حافظ محمود شیرانی)

مشق

۱۔ ''جلوۂ سحر'' میں پیش کیا گیا صبح کا منظر اپنے الفاظ میں بیان کریں۔
۲۔ اس نظم میں صبح کا منظر بڑی خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ آپ شام کے منظر کو اپنے الفاظ میں بیان کریں۔
۳۔ آخری بند میں شاعر نے صبح کو ''حسینۂ سحر'' کے ایک کردار کی صورت میں پیش کرتے ہوئے اس کے استقبال کو کن لفظوں میں بیان کیا ہے؟
۴۔ جملے بنائیں۔
یکایک۔ سعادت۔ صحت آفریں۔ جلوہ گاہ۔ جوئبار۔ آبشار۔
۵۔ کنایہ کی تعریف کریں اور مثالوں کی مدد سے وضاحت کریں۔

سید محمد جعفری

پیدائش: ۱۹۰۵ء

وفات: ۱۹۷۶ء

سید محمد جعفری نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی ایس سی آنرز (کیمیا) کی سند حاصل کرنے کے بعد علم کی تشنگی بجھانے کے لیے ایم اے فارسی اور ایم اے انگریزی ادبیات کیا۔ ان کے اساتذہ میں ممتاز مزاح نگار پطرس بخاری بھی شامل تھے۔

سید محمد جعفری نے مصوری اور خطاطی کی تعلیم و تربیت بھی حاصل کی۔ کچھ عرصہ محکمۂ تعلیم سے منسلک رہے۔ بعد ازاں وزارتِ اطلاعات و نشریات سے وابستہ ہو گئے اور وہیں سے ریٹائرمنٹ لی۔ سید محمد جعفری کا شمار ایسے طنزیہ اور مزاحیہ شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے ظرافت اور طنز کو ملکی اور سماجی اصلاح کا ہر ہتھیار بنایا۔ اُن کا طنز کاری ضرور ہے مگر اس قدر شگفتہ ہے کہ قاری کو نہ صرف لطف اندوز کرتا ہے بلکہ غور و فکر اور اصلاح کی دعوت بھی دیتا ہے۔ وہ ملکی ثقافت اور تہذیب و تمدن کو مغربی اثرات سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نظم "پُرانا کوٹ" میں اُنھوں نے غلامانہ ذہنیت کو طنز کا نشانہ بنایا ہے اور ماضی سے عبرت حاصل کرنے کا درس دیا ہے۔

مجموعۂ کلام: شوخیٔ تحریر

پرانا کوٹ

سید محمد جعفری

خریدا جاڑوں میں نیلام سے پرانا کوٹ
جو پھٹ کے چل نہ سکے، یہ نہیں ہے ایسا نوٹ
بنا ہے کوٹ یہ نیلام کی دکاں کے لیے
''صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے''
بڑا بزرگ ہے یہ آزمودہ کار ہے یہ
کسی مرے ہوئے گورے کی یادگار ہے یہ
پرانی وضع کا بے حد عجیب جامہ ہے
پہن چکا اسے خود ''واسکوڈی گاما'' ہے
نہ دیکھ کہنیوں پر اس کی خستہ سامانی
پہن چکے ہیں اسے تُرک اور ایرانی
جگہ جگہ وہ پھرا مثلِ ''مارکوپولو''
وہ کوٹ کوٹوں کا لیڈر ہے اس کی جے بولو
بڑا بزرگ ہے گو وہ قلیل قیمت ہے
میاں! بزرگوں کا سایہ بڑا غنیمت ہے
ہیں اس پہ دھبے جو سرخی کے اور سیاہی کے
نشان ہیں کسی ٹیچر کی بادشاہی کے

جگہ جگہ جو یہ کیڑوں کی ضرب کاری ہے
نئی طرح کی یہ صنعت ہے، دستکاری ہے
جو قدر دان ہیں، وہ جانتے ہیں قیمت کو
کہ آفتاب چرا لے گیا ہے رنگت کو

یہ کوٹ کوٹوں کی دنیا کا باوا آدم ہے
اگرچہ ہے وہ تنگ، جو نگاہ سے کم ہے
دہانِ زخم کی مانند ہنس رہے ہیں کاج
وصول کرتے ہیں چینی کی انگھڑیوں سے خراج

جگہ جگہ جو یہ دھبے ہیں اور چکنائی
پہن چکا ہے کبھی اس کو کوئی حلوائی

گذشتہ صدیوں کی تاریخ کا ورق ہے کوٹ
خریدو اس کو کہ عبرت کا اک سبق ہے کوٹ

(شوخیٔ تحریر)

مشق

۱۔ شاعر نے پرانے کوٹ کی خامیوں کو کیسے خوبیاں بنا کر پیش کیا ہے۔

۲۔ تشبیہ اور استعارے سے کیا مراد ہے؟ اس نظم میں شاعر نے پرانے کوٹ کے لیے کیا کیا تشبیہات اور استعارات استعمال کیے ہیں؟

۳۔ مصرے مکمل کریں۔

(ا) کسی مرے ہوئے گورے کی ______________________

(ب) پہن چکے ہیں اسے ______________________

(ج) میاں بزرگوں کا سایہ ______________________

(د) نئی طرح کی یہ صنعت ہے ______________________

(ہ) گذشتہ صدیوں کی تاریخ کا ______________________

۴۔ نظم ''پرانا کوٹ'' کا مرکزی خیال لکھیں۔

۵۔ قافیہ ہم آواز الفاظ کو کہتے ہیں، جیسے کوٹ اور نوٹ، دکان اور نکتہ داں، اس نظم میں اور کون کون سے قافیے استعمال ہوئے ہیں؟

۶۔ کسی شاعر کے ایک مصرعے پر دوسرا مصرع لگا کر نیا شعر کہنا ''صنعتِ تضمین'' کہلاتا ہے۔

مثلاً:

بنا ہے کوٹ یہ نیلامی کی دُکان کے لیے
''صدائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے''

ایسے تین اشعار تحریر کریں جن میں صنعتِ تضمین کا استعمال ہو۔

سید ضمیر جعفری

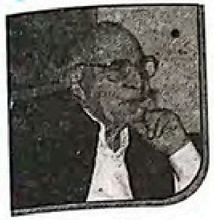

پیدائش: یکم جنوری ۱۹۱۶ء

وفات: ۱۲ رمئی ۱۹۹۹ء

اصل نام سید ضمیر حسین ہے۔ ضلع جہلم کے ایک گاؤں چک عبدالخالق میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے اسکول میں حاصل کی۔ ثانوی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم سے پائی۔ گورنمنٹ کالج کیمبل پور (اٹک) سے ایف اے کیا اور بی اے کی ڈگری اسلامیہ کالج لاہور سے حاصل کی۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد صحافت کے کوچے میں قدم رکھا اور مولانا چراغ حسن حسرت کے اخبار "شیرازہ" میں بطور معاون مدیر کام کرتے رہے۔ بعد میں ایک فوجی اخبار کے عملۂ ادارت میں شامل ہوگئے۔ وہاں سے فوج میں کمیشن حاصل کیا۔ میجر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ بعدازں مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔

سید ضمیر جعفری نے مزاحیہ شاعری میں زندگی کی ناہمواریوں کو آشکارا کرنے اور تاثر کی شدت سے اصلاحی مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے ہاں زندگی کو اعتنا کی نظر سے دیکھنے اور اس کی حالت بدلنے کا انداز نمایاں ہے۔ اُن کے منتخب کردہ موضوعات پھول کی طرح کھلتے اور بے ساختہ مسکراہٹ کو جنم دیتے ہیں۔

تصانیف: قریۂ جاں، مافی الضمیر، مسدس بدحالی، کنر شیر خان، کتابی چہرے، من میلہ وغیرہ۔

یہ سڑکیں

زمیں پر آدمی کی اوّلیں ایجاد یہ سڑکیں
پرانے وقت کے بغداد کی اولاد یہ سڑکیں
مرمت کی حدوں سے زائد المیعاد یہ سڑکیں
ہمارے شہر کی مادر پدر آزاد یہ سڑکیں
بظاہر صید، لیکن اصل میں صیّاد یہ سڑکیں

دمِ بارانِ رحمت گرد کا گرداب ہوجانا
گڑھوں کا پھیل کر تالاب در تالاب ہوجانا
بھر کر نالیوں کا "رستم و سہراب" ہوجانا
محلے کے گلی کوچوں کا زہرہ آب ہوجانا
مہینوں تک برنگِ ہرچہ بادا باد یہ سڑکیں

بہرگامے سڑک کھاجانے والی کھائیاں دیکھو
چٹختے راستوں کی ٹوٹتی انگڑائیاں دیکھو
کھڑی اُونچائیوں کے پیٹ میں گہرائیاں دیکھو
گڑھوں کی جابجا بہزادیاں، چغتائیاں دیکھو
نقوشِ مانی و چغتائی، و بہزاد یہ سڑکیں

ہم اِن سے حلم و صبر و شکر کا پیغام لیتے ہیں
کہ جب چلتے ہیں کم از کم خُدا کا نام لیتے ہیں
یہ کام آئیں نہ آئیں ہم انھی سے کام لیتے ہیں
"گلوں سے خار بہتر ہیں، جو دامن تھام لیتے ہیں"
ہم ان سے مطمئن ہیں اور ہم سے شاد یہ سڑکیں

مشق

نظم میں شہری سڑکوں کا نقشہ کس طرح کھینچا گیا ہے؟

نظم ''یہ سڑکیں'' کا خلاصہ لکھیں۔

تلمیح سے مراد شاعری میں کسی تاریخی واقعے یا کردار کا ذکر ہوتا ہے، اس نظم میں شاعر نے کون کون سی تلمیحات بیان کی ہیں؟

مصرعے کی وضاحت کریں:

پرانے وقت کے بغداد کی اولاد یہ سڑکیں

درج ذیل کے چار چار ہم قافیہ الفاظ لکھیں۔

ایجاد ، گرداب ، گھر ، قلم ، خار۔

''گھوں سے خار بہتر ہیں، جو دامن تھام لیتے ہیں''

شاعر نے یہ مصرع واوین میں کیوں لکھا ہے؟ وضاحت کریں۔

مخمس:

جس نظم کے ہر بند میں پانچ مصرعے ہوں، اُسے ''مخمس'' کہتے ہیں۔

مرزا محمود سرحدی

پیدائش: ۱۹۱۴ء وفات: ۱۹۶۸ء

مرزا محمود سرحدی پشاور میں پیدا ہوئے۔ وہ اوائلِ زندگی ہی سے غمِ روزگار کے چکر میں پڑ گئے۔ انھیں زندگی گزارنے کے لیے بڑے جتن کرنے پڑے۔ فوجی نوکری سے لے کر اسکول میں مدرسی تک اور کلرکی سے مزدوری تک کئی مراحل سے گزرنا پڑا۔

اُنھوں نے اکبر الٰہ آبادی کے طنزیہ و مزاحیہ انداز کی تقلید کی ہے اور اسی وجہ سے انھیں ''اکبرِ سرحد'' بھی کہا جاتا ہے۔ مرزا کے مزاح میں لفظوں کی ہیرا پھیری نہیں ملتی، بلکہ اُن کا مزاح ایک حقیقت پسند کا مزاح تھا، جو وہ حالات و واقعات اور اُن کے نتائج سے پیدا کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے لیے، جس میدان کا انتخاب کیا، وہ فن کے اعتبار سے دشوار ترین رہگزار سے کم نہیں۔ طنز اور مزاح کی تمام تر لطافتوں کو برقرار رکھتے ہوئے انتہائی مختصر پیرائے میں جامع اور مکمل بات کا اظہار کرنا بے حد مشکل کام ہے، اس میں ایک طرف شاعر سنجیدگی سے دامن بچاتا ہے، تو دوسری طرف پھکڑ پن کی حدود سے دُور رہتا ہے۔

مرزا محمود سرحدی نے ہر موضوع پر طبع آزمائی کی، لیکن اُن کا اصل میدان ''قطعات'' ہیں۔ اُنھوں نے چھوٹے چھوٹے معاشرتی مسائل کو بڑی خوبصورتی سے اپنے قطعات میں سمویا ہے۔ مثلاً: چوری، رہزنی، ذخیرہ اندوزی، گراں فروشی، ملاوٹ، جھوٹ اور مکر و فریب وغیرہ۔ ان کا طنز سماجی ناسوروں کے لیے کسی نشتر سے کم نہیں۔ مرزا محمود سرحدی نے ساری عمر شادی نہیں کی زندگی کے آخری ایام میں دمے کے مرض کی وجہ سے علیل رہنے لگے تھے۔ اُنھوں نے پشاور میں وفات پائی۔

مجموعۂ ہائے کلام: سنگینے، اندیشۂ شہر۔

قطعات

مرزا محمود سرحدی

کبھی تو ان کی حسینوں سے شکل ملتی ہے
خدا کی شان ہے، وہ ہیں مرے وطن کے جواں
کبھی پناہ گزینوں سے شکل ملتی ہے
کہ جن کی پردہ نشینوں سے شکل ملتی ہے

☆

کیا بتائیں آپ کو کیا ہے ہمارا ہسپتال
انتظام ایسا کہ بس دل کی کلی کھِل جائے ہے
حادثاتِ اتفاقی کا بھی ہے اک ڈاکٹر
اتفاقی طور پر مل جائے، تو مل جائے ہے

☆

اگر کوچوں میں بھنگی رات کو جاروب کش پاؤ
تو جانو یہ بھی ہے اک شانِ بیداری کمیٹی کی
غلاظت جس سڑک پر جابجا بکھری ہوئی دیکھو
تو سمجھو اس طرف سے گزری ہے لاری کمیٹی کی

☆

کالے چشمے بھی ایک نعمت ہیں
دھوپ میں خوب کام دیتے ہیں
جو نگاہیں ملا نہیں سکتے
رات دن اِن سے کام لیتے ہیں

☆

محتسب سے کہوں، تو کیا جاکر
میری مانند وہ بھی روتا ہے
پہلے ہوتا تھا دودھ میں پانی
آج پانی میں دودھ ہوتا ہے

(اندیشۂ شہر)

مشق

۱۔ شاعر کو نوجوان نسل سے کیا شکایت ہے؟

۲۔ اِن قطعات میں کن معاشرتی برائیوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔

۳۔ مصرعے مکمل کریں۔

(ا) انتظام ایسا کہ بس ....

(ب) اگر کوچوں میں بھنگی رات کو ....

(ج) کالے چشمے بھی ....

(د) آج پانی میں ....

۴۔ جملوں میں استعمال کریں:

دل کی کلی کھِلنا۔ نعمت۔ نگاہیں ملانا۔ محتسب۔ مانند۔

۵۔ قطعہ کسے کہتے ہیں؟ کسی شاعر کا قطعہ لکھیں جس میں شگفتہ پیرائے میں کسی سماجی برائی کا ذکر کیا گیا ہو۔

ہدایت برائے اساتذہ:	طلبہ کو اقبالؒ اور اکبر کے چند قطعات لکھوائیں۔

عبدالرحمٰن باباؒ

وفات: ۱۷۱۱ء

پیدائش: ۱۶۵۳ء

سترھویں صدی پشتو زبان وادب کا دورِ زرّیں تھا۔اس عرصے میں پشتو زبان وادب کے بے شمار مستند اور معتبر شاعر وادیب گزرے ہیں۔جن میں خوشحال خان خٹک، عبدالحمید مومند، عبدالقادر خٹک، اشرف خان ہجری اور معزاللہ مومند کے ساتھ ساتھ عبدالرحمٰن باباؒ قابلِ ذکر ہیں۔

عبدالرحمٰن باباؒ نے ساری زندگی اپنے آبائی گاؤں (بہادر کلے) ہزارخوانی پشاور میں گزاری۔ اُن کی شاعری پر فطرت اور حقیقت کا رنگ غالب ہے۔ایسا لگتا ہے کہ وہ ہر دور اور ہر زمانے کے شاعر ہیں۔اُن کے اشعار میں ماضی کی تاریخ، حال کا تذکرہ اور مستقبل کا پیغام جھلکتا ہے۔اُن کا دیوان اگرچہ مختصر ہے لیکن علم وادب کے لحاظ سے جامع اور مکمل ہے۔پختون فطرت کی ترجمانی جس طرح عبدالرحمٰن باباؒ نے کی ہے کسی اور شاعر نے نہیں کی۔اسی لیے جو مقبولیت اُن کو حاصل ہے، کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔اُن کے اشعار نہ صرف عشقِ حقیقی اور تصوف کے آئینہ دار ہیں، بلکہ ابدی زندگی میں کامیابی کے لیے پند نامہ بھی ہیں۔قرآن واحادیث کی تشریح وتوضیح اُن کی شاعری کا خاصہ ہے۔اُن کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اُن کے دیوان کے تراجم دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں اور لوگ اُن کی تعلیمات سے مستفید ہورہے ہیں۔اُن کی شاعری کے موضوعات محنت کی عظمت، رزقِ حلال، اسلامی اصول، علم کی اہمیت وافادیت اور دنیا کی بے ثباتی جیسے حقائق پر مبنی ہیں۔

مجموعۂ کلام: دیوان عبدالرحمٰن باباؒ۔

عبدالرحمٰن بابا / مترجم: طٰہٰ خان

اخلاص

ہم دوشِ ثُریا ہے مقامِ اخلاص
جو ملتا ہے، ملتا ہے غلامِ اخلاص

گو فرش سے تا عرش سفر ہے دشوار
طے کرتی ہے بہ یک جُنبش گامِ اخلاص

فانی ہے ہر اک چیز، ہر اک رَسم و رواج
باقی ہے، مگر ایک دوامِ اخلاص

اسلام ہے پابندیِ اخلاص کا نام
اور نام ہے اسلام کا نامِ اخلاص

صَیّاد کو ممکن ہے ہما ہاتھ لگے
پھیلائے محبت سے جو دامِ اخلاص

حاجت نہیں اخلاص کی کچھ بعدِ فنا
قائم کرو ہستی میں نظامِ اخلاص

شیرینیِ گفتار پہ حیرت کیسی
ہے گفتۂ رحمٰن کلامِ اخلاص

(متاعِ فقیر)

مشق

۱۔ اس نظم میں "اخلاص" کی جو تعریفیں بیان کی گئی ہیں، انھیں مختصراً لکھیں۔

۲۔ "ہما" پرندے کی کیا خصوصیت بیان کی جاتی ہے؟

۳۔ اخلاص کی وجہ سے کون سا سفر آسان ہو جاتا ہے؟

۴۔ اس نظم کا مرکزی خیال بیان کریں۔

۵۔ فانی ہے ہر اک چیز ہر اک رسم و رواج
باقی ہے مگر ایک دوامِ اخلاص

کلام میں دو ایسے الفاظ استعمال کرنا جو ایک دوسرے کی ضد ہوں "صنعتِ تضاد" کہلاتا ہے۔ جیسے مندرجہ بالا شعر میں "فانی" اور "باقی" ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ صنعتِ تضاد کی تعریف کریں اور تین مثالیں لکھیں۔

ہدایات برائے اساتذہ	طلبہ کو عبدالرحمٰن باباؒ کے چند ضرب المثل اشعار سنائیں۔

حصۂ غزل

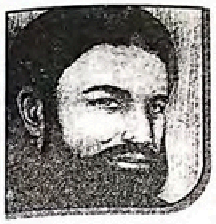

میر تقی میر

پیدائش: ۱۷۲۱ء

وفات: ۱۸۱۰ء

میر تقی میر کی شاعری زندگی کے انقلابات کی ترجمان رہی ہے۔ اگرچہ بعض ناقدین نے میر کو قنوطیت کا حامل شاعر بھی کہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میر تقی میر کا تخلیقی شعور زندگی کی مایوسیوں کی نشان دہی کر کے بھی گم کر دینے والی یاسیت کی منزل سے نہ صرف فاصلے پر رہتا ہے، بلکہ زیرِ سطح ایک نشاطیہ احساس کو جگانے کا باعث بھی بنا رہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ میر کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف نہ صرف ان کے معاصرین نے کیا ہے، بلکہ اب تک کے تمام مستند ناقدین اور غزل کے معتبر شعرا نے میر کے کلام کی ہمہ گیریت، نشتریت اور افادیت کو کھلے دل سے تسلیم کیا ہے۔ غالب جیسے یگانہ روزگار شاعر نے برملا یہ کہا:

ریختہ کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

میر کو خدائے سخن کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ میر کا اُسلوبِ بیان سادہ اور سلیس ہونے کے باوجود ندرت اور انفرادیت کا حامل ہے۔ ان کے کلام میں روزمرہ اور محاورے کا التزام بخوبی موجود ہے۔ اُن کے عہد کو اردو شاعری کے زریں عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اُنھوں نے اردو ادب کو چھے ضخیم مجموعہ ہائے کلام دیے، جن کی قدر و قیمت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ گویا میر تقی میر کا یہ دعویٰ بالکل درست ثابت ہوا ہے:

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

تصانیف: چھے دیوان (اردو)، دیوان میر (فارسی)، ذکر میر (خود نوشت) اور نکات الشعراء (تذکرہ)

غزل

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں! خوش رہو ہم دُعا کر چلے

وہ کیا چیز ہے آہ! جس کے لیے
ہر اِک چیز سے دل اٹھا کر چلے

کوئی ناامیدانہ کر کے نگاہ
سو تم ہم سے منھ بھی چھپا کر چلے

دکھائی دیے یوں کہ بے خود کیا
ہمیں آپ سے بھی جُدا کر چلے

جبیں سجدہ کرتے ہی کرتے گئی
حقِ بندگی ہم ادا کر چلے

پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے
نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میرؔ
جہاں میں تم آئے تھے، کیا کر چلے

(انتخاب کلام میر)

غزل

پیری میں کیا جوانی کے موسم کو رویئے
اب صبح ہونے آئی ہے ، اک دم تو سویئے

اخلاصِ دل سے چاہیے سجدہ نماز میں
بے فائدہ ہے ورنہ جو یوں وقت کھویئے

کس طور آنسوؤں میں نہاتے ہیں غم کشاں
اس آبِ گرم میں تو نہ انگلی ڈبویئے

اب جانِ جسمِ خاک سے تنگ آ گئی بہت
کب تک اس ایک ٹوکری مٹی کو ڈھویئے

آلودہ اُس گلی کے جو ہوں خاک سے تو میرؔ
آبِ حیات سے بھی نہ وے پاؤں دھویئے

(انتخاب کلامِ میر، ڈاکٹر مولوی عبدالحق)

مشق

۱۔ درست الفاظ کا انتخاب کریں۔

(ا) ہر شعر میں.......... مصرعے ہوتے ہیں۔
- دو
- چار
- تین
- پانچ

(ب) غزل کے پہلے شعر کو.......... کہتے ہیں۔
- ردیف
- بیت الغزل
- مقطع
- مطلع

(ج) غزل کے.......... میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔
- مطلع
- مقطع
- درمیان
- آغاز

(د) میر کو.......... کہا گیا۔
- خدائے سخن
- بابائے اردو
- بلبلِ ہند
- اردو غزل کا باوا آدم

(ہ) غزل کے تمام اشعار کا.......... مفہوم ہوتا ہے۔
- الگ الگ
- ایک
- متضاد
- مبارک

(و) میر کی غزل کا بنیادی موضوع.......... ہے۔
- غم
- شک
- خوشی
- حُسن

۲۔ کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میرؔ
جہاں میں تم آئے تھے، کیا کر چلے

میر کی غزل کے اس مقطع کی تشریح کریں نیز یہ بھی واضح کریں، کہ اس میں علم بیان کی کون سی خوبی پائی جاتی ہے؟

۳۔ مندرجہ ذیل مصرعوں کے ساتھ دوسرا مصرع لگا کر شعر مکمل کریں۔

(ا) فقیرانہ آئے صدا کر چلے
(ب) وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لیے
(ج) دکھائی دیے یوں کہ بے خود کیا
(د) پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے
(ہ) کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میر

۴۔ میر کی شاعرانہ خصوصیات پر نوٹ لکھیں۔

غزل کی تعریف:

غزل کا لفظ عربی زبان کا ایک مصدر ہے۔ جس کے معنی "کاتنا" (چرخے پر روئی سے سُوت "دھاگہ" بنانا) ہے۔
ادب کی رُو سے غزل کے معنی ہیں عورتوں سے باتیں کرنا، عورتوں کے حُسن جمال کی تعریف کرنا۔
غزل نظم کی ایسی صنف ہے جس میں عشق و محبت (حقیقی و مجازی) کا ذکر ہوتا ہے۔
غزل کے کم از کم اشعار کی تعداد پانچ اور زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔

خواجہ میر دردؔ

پیدائش: ۱۷۲۰ء

وفات: ۱۷۸۵ء

خواجہ میر درد دِلّی میں پیدا ہوئے۔ گو تصوف کے مضامین اُردو کے بیشتر شعرا نے باندھے ہیں لیکن اِن میں جو تکمیلی شان دردؔ نے پیدا کی ہے، وہ انھی کا حصہ ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ صوفی تھے۔ دردؔ قلبی واردات کے اظہار کے لیے جن الفاظ کا چناؤ کرتے ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ الفاظ بنے ہی اس مقصد کے لیے ہوں۔ دردؔ کی صوفیانہ شاعری وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے فلسفوں کا خوب صورت امتزاج پیش کرتی ہے۔ خواجہ میر درد تصوف کے فلسفیانہ مضامین کو جس بے ساختگی اور سادگی سے بیان کرتے ہیں، وہ اُنھیں کے ساتھ مخصوص ہے۔ اُن کی غزل میں تغزل صرف تصوف کی بدولت پیدا ہوتی ہے۔ دردؔ کے ہاں عشق اور تصوف ایک دوسرے سے الگ نہیں بلکہ باہم مربوط ہیں۔ انھوں نے محاورہ اور روزمرہ کثرت سے استعمال کیا اور نہ صرف غزل کی تہذیبی روایت پیدا کی بلکہ اسے ارتقا کے اگلے زینے پر چڑھنے کا راستہ بھی دکھایا۔ اُردو شاعری کو دردؔ نے ایک ہی مجموعۂ کلام (دیوان درد) دیا ہے لیکن معیار کے اعتبار سے وہ اتنا بلند پایہ ہے کہ اسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور جس نے دردؔ کو غزل گو شعرا کے صفِ اوّل میں کھڑا کر دیا ہے۔

تصانیف: شمع محفل، آہ سرد، نالہء درد، واردات، درد ِدل اور علم الکتاب

خواجہ میر درد

غزل

قتلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور
شمع کے منہ پہ جو دیکھا ، تو کہیں نور نہ تھا

ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً ، لیکن
میں جو پہنچا تو کہا ، خیر یہ مذکور نہ تھا

باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے
واں پہ پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا

پرورش غم کی ترے یاں تئیں تو کی ، دیکھا
کوئی بھی داغ تھا سینے میں کہ ناسور نہ تھا

محتسب آج تو مے خانے میں تیرے ہاتھوں
دل نہ تھا کوئی، کہ شیشے کی طرح چور نہ تھا

دردؔ کے ملنے سے اے یار! بُرا کیوں مانا
اس کو کچھ اور سوا دید کے ، منظور نہ تھا

(دیوانِ دردؔ مرتبہ ظل الرحمٰن داؤدی)

مشق

۱۔ خالی جگہ مناسب لفظ کے انتخاب سے پُر کریں۔

(ا) قتلِ عاشق کسی .... سے کچھ دور نہ تھا (معشوق ، محبوب ، دشمن)

(ب) رات مجلس میں ترے .... کے شعلے کے حضور (آگ ، حسن ، ناز)

(ج) واں پہ پہنچا کہ .... کا بھی مقدور نہ تھا (انسان ، آدمی ، فرشتے)

(د) محتسب آج تو .... میں تیرے ہاتھوں (تھانے ، جیل خانے ، مے خانے)

(ہ) درد کے ملنے سے اے .... بُرا کیوں مانا (یار ، دوست ، دشمن)

۲۔ ردیف کسے کہتے ہیں؟ اس غزل کی ردیف کی نشان دہی کریں۔

۳۔ دور، دستور، مذکور وغیرہ اس غزل کے قافیے ہیں۔ ایسے پانچ ہم قافیہ الفاظ لکھیں جو اس غزل میں موجود نہ ہوں۔

۴۔ کنایہ قریب اور کنایہ بعید میں، مثالوں کی مدد سے فرق واضح کریں۔

۵۔ اس غزل کے قوافی لکھیں۔

۶۔ مندرجہ ذیل کی تعریف کریں اور دو دو مثالیں لکھیں۔
مراعاۃ النظیر، حُسنِ تعلیل، لف و نشر، تلمیح، تضمین۔

۷۔ آپ کو اس غزل میں دردؔ کا کون سا شعر پسند ہے اور کیوں؟

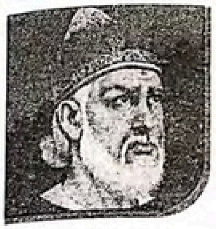

شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ

پیدائش: ۱۷۵۱ء

وفات: ۱۸۲۴ء

مصحفیؔ کی غزل دبستانِ دلّی اور دبستانِ لکھنؤ کے دِل آویز اِمتزاج کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ اُن کی غزل میں ایک طرف دبستانِ دلّی کا سوز وگداز ہے تو دوسری جانب دبستانِ لکھنؤ کی پیکر تراشی کا رجحان بھی نظر آتا ہے۔

مصحفیؔ کا اسلوب نہایت سلیس، بے حد سادہ اور تخلیقی نفاست کا حامل ہے۔ اُن کے لہجے میں ایک دھیماپن اور ٹھہراؤ ہے جو اُن کی غزل میں ایک طلسماتی فضا پیدا کرتا ہے۔ مصحفیؔ کو غزل پر ایک استادانہ کمال حاصل ہے۔ وہ پائمال موضوعات کو بھی نئے انداز سے برتتے ہوئے اِن میں کوئی نہ کوئی جدت کا پہلو پیدا کرتے ہیں۔ ان کے کئی ایک اشعار کو ضرب المثل کی حیثیت حاصل ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں لکھا ہے کہ ''یہ اُصولِ فن سے بال برابر بھی سرکتے نہ تھے۔ کلام پر قدرتِ کامل پائی تھی۔ الفاظ کو پس وپیش اور مضمون کو کم وبیش کر کے اس در وبست سے شعر میں کھپاتے تھے، کہ جو حق استادی کا ہے ادا ہو جاتا تھا''۔

مصحفیؔ کی غزلیات میں روانی اور جوانی پائی جاتی ہے۔ وہ صحت زبان کا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کے اشعار میں ترنم پایا جاتا ہے اور یہ کیفیت موزوں اصوات کی تکرار سے پیدا ہوتی ہے۔

غزل

ناگہ چمن میں جب وہ گل اندام آگیا
گل کو شکستِ رنگ کا پیغام آگیا

اٹھا جو صبحِ خواب سے وہ مست پُر خمار
خورشید کف کے بیچ لیے جام آگیا

افسوس ہے کہ ہم تو رہے مستِ خوابِ صبح
اور آفتابِ عمر لبِ بام آگیا

ہے جائے رحم حال پہ یاں اُس اسیر کے
جو گرتے ہی ہوا سے تہِ دام آگیا

سمجھو خدا کے واسطے پیارے بُرا نہیں
دو دن ، اگر کسی کے کوئی کام آگیا

کر قطع کب گیا ترے کوچے سے مصحفیؔ ؟
گر صبح کو گیا ، وہیں پھر شام آگیا

مشق

۱۔ مصحفی کی شامل نصاب غزل میں جو تراکیب استعمال ہوئی ہیں اُنھیں تحریر کریں۔

۲۔ مصحفی کی غزل میں ردیف اور قافیوں کی نشان دہی کریں۔

۳۔ اس غزل میں سے چند مرکباتِ اضافی لکھیں۔

۴۔ ان مصرعوں کا مفہوم واضح کریں۔

- گل بدست رنگ کا پیغام آگیا
- خورشید کف کے بیچ لیے جام آگیا
- جو گرتے ہی ہوا تہہِ دام آگیا

۵۔ درج ذیل الفاظ وتراکیب کو جملوں میں استعمال کریں۔

گل اندام، پیغام، کف، تہہِ دام، اسیر، آفتابِ عمر۔

۶۔ مصحفی کی غزل کے دوسرے شعر میں جس صنعت کا استعمال ہوا ہے، اس کی تعریف کریں اور دو مثالیں دیں۔

شعر:
وہ کلامِ موزوں جو بامقصد ہو، ایک خیال کو ظاہر کرے اور جس کے دونوں مصرعے ایک ہی وزن میں ہوں ''شعر'' کہلاتا ہے۔

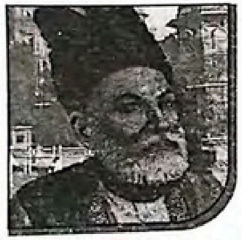

مرزا اسداللہ خان غالبؔ

پیدائش: ۲۷ر دسمبر ۱۷۹۷ء | وفات: ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء

مرزا اسداللہ خان غالب آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں اسدؔ اور بعد میں غالبؔ تخلص اختیار کیا۔ شاہی دربار سے نجم الدولہ اور دبیرالملک کے خطاب پائے۔ غالبؔ کے آبا و اجداد ترک سلجوق تھے جو مغلیہ عہد میں ماوراء النہر سے ہندوستان آئے اور اچھے سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ ان کے چچا نصراللہ بیگ شاہی فوج میں رسالدار تھے۔ نوابانِ لوہارو سے مرزا غالب کا سسرالی رشتہ تھا۔ اپنی خاندانی وجاہت پر انھیں ناز تھا:

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزّت نہیں مجھے

اپنی شعرگوئی کے پہلے دور میں غالب نے مشکل پسندی اختیار کی لیکن پھر سادہ طرز اپنایا۔ خیال کی لطافت، بلندی، روزمرہ اور محاوَرات کا لطف، طرزِ ادا کی شوخی اور موضوعات کی رنگارنگی نے ان کے کلام کو منفرد اور دلکش بنا دیا۔ زندگی کے غموں اور دکھوں کے باوجود وہ خوش طبعی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ ان کی شاعری کی ایک اہم خوبی مُحاکات ہے۔ وہ لفظوں سے تصویر کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی شاعری کا انتخاب ''دیوان غالب'' کی شکل میں کیا اور ان کی شاعرانہ عظمت میں اس انتخاب کو بڑا دخل ہے۔ اُردو کا یہ عظیم شاعر دِلّی میں انتقال کر گیا۔

تصانیف: دیوانِ غالب، اُردوئے معلّٰی، عُودِ ہندی، لطائفِ غیبی، کلیاتِ غالب (فارسی)، قاطعِ برہان، دستنبو وغیرہ۔

غزل

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

کیوں گردشِ مُدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یارب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں

حد چاہیے سزا میں، عقوبت کے واسطے
آخر گنہگار ہوں، کافر نہیں ہوں میں

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے
لعل و زمرّد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ
رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

کرتے ہو مجھ کو منعِ قدم بوس کس لیے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دُعا
وہ دِن گئے، جو کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

(۲)

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈرے کیوں میرا قاتل؟ کیا رہے گا اس کی گردن پر؟
وہ خوں جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دم بہ دم نکلے

نکلنا خُلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں، لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طُرّۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستہ تیغِ ستم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

کہاں مے خانے کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

(دیوانِ غالب)

مشق

۱۔ ؎ کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

غالب کے اس شعر کی تشریح کریں نیز یہ بتائیں کہ اس میں علمِ بیان کی کون سی خوبی پائی جاتی ہے۔

۲۔ مندرجہ ذیل مصرعوں کا مفہوم واضح کریں۔

(ا) لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں
(ب) رتبے میں مہر و ماہ سے کم تر نہیں ہوں میں
(ج) وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں
(د) بہت نکلے میرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے
(ہ) اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں، جس کافر پہ دم نکلے

۳۔ غالب کی پہلی غزل کی ردیف تحریر کریں۔

۴۔ غالب کی دوسری غزل کے قافیوں کی نشان دہی کریں۔

۵۔ آپ کو غالب کا کون سا شعر زیادہ پسند ہے اور کیوں؟

۶۔ مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کو جملوں میں استعمال کریں۔
حرفِ مکرر۔ نقش و زمرد۔ مہر و ماہ۔ کمتر۔ عقوبت۔ گردش مدام۔ بھرم کھلنا۔ چشمِ تر۔

۷۔ غالب کے کلام کی نمایاں خصوصیات تحریر کریں۔

داغ دہلوی

پیدائش: ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء

وفات: ۱۹۰۵ء

نواب مرزا خان داغ دلّی میں پیدا ہوئے۔ قلعہ معلٰی میں پرورش پائی۔ قلعہ میں مشاعروں کی رونق کو داغ نے قریب سے دیکھا اور یہیں سے ان کا ذوقِ شاعری اُبھرا اور نکھرا۔ شاعری میں استاد ذوق کے شاگرد تھے۔

داغ کے یہاں جو چیز سب سے نمایاں ہے وہ لطفِ محاورہ اور زبان کا چٹخارہ ہے۔ اُن کا اندازِ بیان بڑا خوبصورت ہے۔ داغ کی غزلوں میں عشق کی معاملہ بندی، شوخی اور مسرت کے جذبات کی فراوانی ہے۔ ان کی شاعری میں میر کا غم یا غالب کا غور و فکر نہیں ہے مگر ان کا اندازِ بیان سہلِ ممتنع کی بہترین مثال پیش کرتا ہے جس کی بدولت ان کی شاعری کو ایک خاص مقام حاصل ہوا ہے۔ ان کی زبان کو سند کا درجہ حاصل ہے۔ ان کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ علامہ اقبال بھی انھیں اپنا کلام اصلاح کے لیے ارسال کیا کرتے تھے۔ ان کی موت پر اقبال نے ایک پُر تاثیر مرثیہ لکھا جس میں داغ کی شاعری کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ اُردو غزل کی تاریخ میں داغ کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ اردو زبان کے فروغ میں بھی ان کی شاعری کا بڑا حصہ ہے۔ داغ کا کلیات اردو شاعری کا قابلِ قدر سرمایہ ہے۔

مجموعۂ ہائے کلام: ماہتاب داغ، گلزار داغ، آفتاب داغ اور یادگار داغ، داغ دہلوی کے نمائندہ شعری مجموعے ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں حیدرآباد میں ان کا انتقال ہوا۔

غزل

آئینہ اپنی نظر سے نہ جدا ہونے دو
کوئی دم اور بھی آپس میں ذرا ہونے دو

کم نگاہی میں اشارا ہے، اشارے میں حیا
یا نہ ہونے دو مجھے چین سے یا ہونے دو

ہم بھی دیکھیں، تو کہاں تک نہ توجہ ہوگی
کوئی دن تذکرۂ اہلِ وفا ہونے دو

آنکھ ملتے ہی کہوں خاک حقیقت دل کی
دیکھ کر جلوہ مرے ہوش بجا ہونے دو

تم دل آزار بنے رشکِ مسیحا کیسے
کم نہ ہونے دو مرا درد سوا ہونے دو

کیا نہ آئے گا اسے خوف مرے قتل کے بعد
دستِ قاتل کو ذرا دستِ دُعا ہونے دو

جب سنا داغ کوئی دم میں فنا ہوتا ہے
اس ستمگر نے اشارے سے کہا: ہونے دو

(کلیاتِ داغ)

مشق

۱۔ موزوں الفاظ کی مدد سے خالی جگہ پُر کریں۔

(ا) آئینہ اپنی .... سے نہ جدا ہونے دو (نظر۔ جگر۔ اثر۔ سفر)

(ب) .... ملتے ہی کہوں خاک حقیقت دل کی (بال۔ ہاتھ۔ آنکھ۔ ناک)

(ج) جب سنا .... کوئی دم میں فنا ہوا ہے۔ (میر۔ درد۔ ذوق۔ داغ)

(د) تم دل .... بنے رشک مسیحا کیسے (آرام۔ آزار۔ آویز۔ افروز)

(ہ) اس ستمگر نے .... سے کہا ہونے دو۔ (اشارے۔ شرارے۔ ستارے۔ نظارے)

۲۔ داغ دہلوی کی غزل کا مطلع تحریر کر کے اس کا مفہوم واضح کریں۔

۳۔ داغ نے غزل کے مقطع میں محبوب کی نفسیات کی کون سی تصویر پیش کی ہے۔

۴۔ مندرجہ ذیل الفاظ وتراکیب کو جملوں میں استعمال کریں۔

کم نگاہی، حیا، رشکِ مسیحا، دستِ دعا، اہلِ وفا، فنا۔

۵۔ داغ کی شاعری پر مختصر نوٹ لکھیں۔

ہدایات برائے اساتذہ:

داغ دہلوی علامہ اقبالؒ کی شاعری کے اُستاد تھے۔ آپ طلبہ کو تفصیل سے آگاہ کریں۔

فرہنگ

اپنی مدد آپ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
پُشتوں	نسلوں	فیلسوفوں	فلسفہ جاننے والے۔ دانشمندوں
پنسال۔ پن سال	پانی نکلنے کے لیے بنا ہوا سوراخ	مارِ سرِ گنج	خزانے کا سانپ، دولت مند کنجوس
نیست و نابود	بالکل ختم کرنا۔ بنیاد مٹا دینا	اِستقلال	مستقل مزاج، مضبوط
حاشا و کلّا	خدا نہ کرے، ہرگز نہیں	پُرکھوں	آباؤ اجداد، باپ دادا۔

جھوٹے آدمی

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
دروغ گو را حافظہ نہ باشد	جھوٹے آدمی کا حافظہ نہیں ہوتا، جھوٹے آدمی کو بات یاد نہیں رہتی	ملکاتِ نفسانی	نفس کی عادتیں
بنج بیپار	کاروبار، خرید و فروخت	متمکّن	جاگزین ہونا، قیام کرنا
قوائے عقلیہ	عقل کی قوتیں	مُلمّع	سونا چاندی کا پانی چڑھا ہوا، دکھاوا
کودن	احمق، نادان	قلعی کھل جانا	حقیقت ظاہر ہونا
اختراع	نئی بات نکالنا	جنگِ زرگری	دکھاوے کی لڑائی، مصنوعی لڑائی
چسکا	مزہ، عادت	صلحِ کُل	سب سے بنا کر رکھنے والا، سب سے دوستی کرنے والا
گوشمالی	کان کھینچنا، سزا دینا	نطق	گویائی، بولنے کی قوت
تعلّی	اپنی بڑائی بیان کرنا	کِذب	جھوٹ، دروغ
		گھڑنا	اپنی طرف سے بات بنانا،

نظریۂ پاکستان

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
جداگانہ	الگ الگ	مساوات	برابری
ترویج	رواج دینا	پیہم	مسلسل
شیوہ	عادت	الحاد	بے دینی
رفیق	دوست	امتیاز	فرق
عناد	دشمنی	توانا	مضبوط
نفاق	پھوٹ/دشمنی	انتشار	بدنظمی
مفاہمت	راضی نامہ	جمعیت	اجتماع/اکٹھ
اُستوار	مضبوط	قیاس	خیال

پاکستانی قومیت کا مسئلہ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
نہج	ڈھنگ، طور، طریقہ	بُوجھ بجھارت	پہیلی بجھوانا
شرمندۂ تعبیر ہونا	جس کی کوئی تعبیر ہو، جس پر عمل ہوسکے	محرر	تحریر کرنے والا
حجت بازی	تکرار کرنا، جھگڑا کرنا	محمول کرنا	گمان کرنا، خیال کرنا
نسلی تعصب	قومیت کی بنیاد پر طرف داری	شیرازہ منتشر کرنا	انتظام درہم برہم کرنا

کچھ ادب کے بارے میں

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
مشاطگی	بنانا سنوارنا، حسین بنانا	آفرینش	پیدائش
تغیرات وانقلابات	تبدیلی	سوتا پھوٹنا	چشمہ جاری ہونا
مدوجزر	جوار بھاٹا، پانی کا اُتار چڑھاؤ	تلاطم	دریا/سمندر کی موجوں کا جوش
بادِسموم	بہت گرم ہوا، لُو	عالم آشکارا	دُنیا پر ظاہر ہونا، مشہور و معروف
صناعانہ	کاریگرانہ، ہنرمندی سے	افتادِطبع	طبیعت کی اُٹھان
منغض	ناراض، رنجیدہ	نووارد	نیا آنے والا
شستگی	پاکیزگی، صفائی		

لمحۂ فکریہ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
وطنِ عزیز	پیارا وطن مراد پاکستان	شرح	نرخ/کھول کر کہنا
مالامال	دولت مند/بھرا ہوا	معیار	اعلیٰ/پیمانہ
متجاوز	اپنی حد سے بڑھنے والا	سکڑنا	تنگ ہونا
ڈیرے ڈالنا	رہائش کر لینا	منصوبہ ساز	منصوبہ بنانے والا
تحفظ	حفاظت	گامزن	چلنے والا
فقدان	نہ ہونا/کمی	نجی	ذاتی
خواندگی	پڑھائی/لکھنے پڑھنے کی قابلیت	رواداری	رکھ رکھاؤ
عوامل	عاملہ کی جمع، واقعات	اقدار	قدر کی جمع، عزت

داروغہ جی کی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
در چوم کے	منت سماجت کر کے	راندے جانا	دھتکارنا
کھداوند	خُداوند	گلام	غلام
اوّل مال	ایک نمبر مال، اعلیٰ درجے کا مال	اندھیر نگری چوپٹ راجا/راج	جہاں ظلم ہو وہاں حکومت ناکام ہو جاتی ہے۔ کوئی پوچھنے والا نہ ہو
گدے بازیاں	عقل دوڑانا، قیاس کرنا	بکھیڑا	جنجال، جھنجھٹ، مصیبت
کھڑی بتادو	یکمشت بتادو	گرج	یہاں مُراد غرض
کتر بیونت	کانٹ چھانٹ	لکھ لُٹ	لاکھوں روپے لُٹانے والا
پھٹکار	لعنت ملامت	کورنمک	نمک حرام
شیر مادر	ماں کا دودھ، جائز، حلال	ساجھا	شریک، شراکت
بھنگ	ایک نشہ آور بوٹی	دست پناہ	چمٹا
دوج	قمری مہینے کی دوسری تاریخ	ٹکر گدا	بھکاری
گیدی	بے عزت، بے غیرت	قرولی	شکاری چاقو
مردک	حقیر آدمی، ناکارہ	کچا چٹھا جڑنا	صحیح صحیح حال بتانا
اُلٹی آنتیں گلے پڑنا	نیکی کا بدلہ بدی میں ملنا	چہرہ شاہی	سرکاری سکہ جس پر بادشاہ کی تصویر ہو
بوہنی	دن کا پہلا سودا	رقم پیرنے	پیسے جمع کرنے/اُٹھانے کے لیے
پرچہ جڑنا	خبر چھاپنا، تشہیر کرنا	کھپریل	کھپروں سے بنائی چھت
کائیاں	چالاک، مکار،	نیاریا	چالاک، جزرس
ہتھے پر ٹوکنا	شروع میں روکنا	ٹیڑھی کھیر	مشکل کام

ہتھے چڑھنا	ہاتھ لگنا	چنیں وچناں	ایسا، ویسا
مطلب خبط ہونا	بات بے معنی ہونا	بیدھا	جادو کے اثر میں مبتلا شخص
بے تے کرنا	گڑبڑ کرنا، اِدھر اُدھر کرنا	سندنہیں	اجازت نہیں
تگڑم	تین افراد کا گٹھ جوڑ	پنجے جھاڑ کر	مکمل طور پر
چت پٹ	ایک قسم کی شرط (toss)	صلواتیں سنانا	گالیاں دینا، بُرا بھلا کہنا
دھپائے گئے	تھپڑ مارے گئے	بے بھاؤ کی پڑنا	مار کھانا، بے عزت ہونا
گھانس نہیں چھیلا	بے کار	مردک خر	گدھے جیسا حقیر
آنکھیں نیلی کرنا	ناراض ہونا، غصے میں آنا	لام کاف بکنا	گالیاں بکنا
اظہار لینا	بیان لینا	مینڈھے لڑانا	فساد ڈلوانا
تا کے باشد	کب تک ایسا ہوگا	جھلے آدمی	چڑچڑے مزاج آدمی
لپاڈگی	جسمانی لڑائی، مار دھاڑ	کندے تول کہ رہنا	اڑنے کے لیے پر تول کہ رہ جانا
چیں چپڑ کرنا	جھگڑا کرنا، تکرار کرنا	ہوائیاں اُڑنا	پریشان ہوجانا
گاؤدی	احمق، نادان	نلوہ اُڑا لیے	بغیر محنت کے فائدہ اُٹھانا
موکھا	بڑا روشن دان یا سوراخ	اُسرار	سر کی جمع، بھید، راز
السیٹھ	دغا، فریب، بددیانتی	چھٹی کا دودھ یاد آنا	بہت شرمندہ ہونا، بہت مار کھانا
از خرس موئے بس است	ریچھ سے بال ملنا بھی غنیمت ہے۔ کنجوس سے تھوڑا ملنا بھی بہت ہے		

آنگن

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
چھکے چھوٹنا	گھبرا جانا، ہواس باختہ ہونا	مبہم	مشکوک، وہ جس کا مطلب صاف نہ ہو
آنگن	صحن	ڈھیلے	مٹی کے بڑے ٹکڑے
ٹھاٹ	آن بان، شان وشوکت	سوانگ رچانا	بھیس بدلنا، فریب دینا۔
ممنونیت	احسان مندی		

خوب صورت بلا

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
عداوت	دشمنی، کینہ، بغض	قیل وقال	بحث مباحثہ، تکرار
دست بستہ	ہاتھ باندھے، مودّب	جلال	رعب ودبدبہ
ہمدم	ساتھی، دوست	عروج مانند	بلندی کی نشانی
محافظ	حفاظت کرنے والا	سپہر	آسمان
چاکر	نوکر، غلام	دربان	دروازے پر پہرہ دینے والا
مگس راں	مکھیاں اُڑانے والا، پنکھا جھلنے والا	ثناخواں	تعریف بیان کرنے والا
بخت یاور	قسمت مددگار	سحاب	بادل
قلزم	گہرا سمندر	وقار	عزت، مرتبہ، بلند مقام

خدام	خادم کی جمع	بلائے ناگہانی	اچانک نازل ہونے والی مصیبت
ہیچ	بے حیثیت، حقیر	اژدر	اژدہا، بہت بڑا سانپ
طینت	فطرت، پختہ عادت	عصمت	پاکیزگی

تعلیم بالغاں

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
شکستہ	پرانی، ٹوٹی پھوٹی	گھڑونچی	لکڑی کا چوکھٹا جس پر گھڑے رکھے جاتے ہیں
کُندہ	موٹی لکڑی کا ٹکڑا	دام اقبالہ	اس کا مرتبہ ہمیشہ بلند رہے
خورد و کلاں	چھوٹے بڑے	درگاہِ خداوندی	اللہ تعالیٰ کا دربار
جُھگی	جھونپڑی	قمچی	لچک دار ٹہنی/چھڑی/شاخ
ازراہِ رحمت	رحمت کرتے ہوئے	بریلی	ہندوستان کا ایک شہر، جہاں کے بانس مشہور ہیں
کُملہ	تمام	ونگ (wing)	پر، طرف
گرانٹ (grant)	حکومت کی جانب سے دی جانے والی امداد	کوائف	کیفیت کی غلط جمع، صحیح جمع کیفیات
گرومندر	کراچی کا ایک علاقہ	بیڑی سوت گیا	بیڑی پی گیا
صدری	واسکٹ		

شیراز اور کنارِ آبِ رُکنا باد وغیرہ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
شیراز	ایران کا ایک قدیم شہر	رُکنا باد	شیراز کی ایک سیرگاہ
داتنیں کاٹنا	مسواک کی لکڑی کاٹنا	چشم	بسر و چشم، یعنی بہت اچھا

Not For Sale

زخاکِ سعدی...... اگر بویم......	سعدی شیرازی کے قبر کی مٹی سے عشق کی خوش بو آرہی ہے۔ اگر اس کے مرنے کے ہزار سال بعد بھی اسے سونگھو	کاریڈور	برآمدہ
زندہ است نام فرخ	فرخ نوشیرواں کا نام زندہ ہے	قافلۂ دزدان برسرِ کوہے نشستہ بودند	چوروں کا قافلہ ایک پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھا تھا
نوشیرواں			
کھڑاگ	جنجال، جھگڑا	داخلی رفاقت	دلی دوستی
نواح	مضافات، اردگرد کا علاقہ	پہنائی	کشادگی، وسعت
حافظ	حفظ کرنے والا، یہاں مراد فارسی کے مشہور شاعر حافظ شیرازی ہے	گلِ صد برگ	ایک پھول کا نام، سو پتیوں والا پھول
غنچۂ نوشگفتہ	تازہ کھلا ہوا پھول	وکیل الرعایہ	رعایہ کا وکیل، یہاں مراد رعایہ کا خادم
جمشید	ایران کا ایک بادشاہ	تومان	ایرانی سکہ
منصور	منصور حلاج	انا الحق	بے شک میں حق ہوں
گے	کتنے	کوس	تقریباً تین سو گز کا فاصلہ
دارا	ایران کا بادشاہ	یدھ	جنگ
پانی چوانے والا	پانی ٹپکانے والا	اے آمدنت باعث آبادیِ ما	آپ کا آنا میرے لیے خوشی کا باعث ہے
بِنا	بنیاد	مسطح	ہموار
ٹُھنٹھ	کٹا ہوا بازو، کٹا ہوا تنا	رفیع الشان	عظیم الشان
صد ستون محل	سوستونوں پر قائم محل	مرتسم	نشان کیا گیا، مہر لگایا گیا

Not For Sale

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
مادر چہ خیالیم	میں کس خیال میں ہوں اور آسمان کس خیال میں ہے۔	برادر بہ جان برابر	میری جان کے برابر میرا بھائی ہے۔
خانہ زاد	غلام	حمال	بوجھ اُٹھانے والے (واحد حمالہ)
قربان نت شوم	تیرے قربان جاؤں		

روم زندہ شہر، مردہ شہر

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
اطالوی	اٹلی کا	لیپا پوتی	مل دینا، برش سے لگانا
قیلولہ	ستانا، دوپہر کا آرام	مزا کافور ہونا	مزا ختم ہو جانا
معنون	عنوان دیا گیا	قیصر	روم کے بادشاہوں کا لقب
بُقعۂ نور	منور مقام	روما الکبریٰ	عظیم روم
تزئین	سجاوٹ، آرائش	کھنڈر	ویران عمارت، ویرانہ
امرائے عظام	عظیم بادشاہ	باندیاں	کنیزیں، لونڈیاں

لالچی وزیر (ترجمہ)

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
ریوڑ	بھیڑ بکریوں کا گلہ	ضعیف الاعتقاد	کمزور عقیدہ رکھنے والا
ہولیا	ساتھ ہو کر روانہ ہو گیا	گڈریا	بھیڑ بکریاں چرانے والا
گھٹنے تہہ کرنا	گھٹنے سمیٹ کر تہہ کر کے بیٹھنا	اسلوب	لکھنے کا انداز
دوزانو بیٹھنا	گھٹنوں کے بل بیٹھنا	لوک	روایتی

مکاتیبِ مرزا غالب

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
بیڑا	خبر، اطلاع	طلائی لوح	سنہری تختی
ہاترس (Hathras)	ہندوستان کی ریاست اُتر پردیش کا ایک ضلع	مطبع	پریس (Press)
دِرنگ	دیر، توقف، تاخیر	زمزمہ پرداز	گیت گانے والا
منہائی	کم کرنا، گھٹانا		

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
قلمرو	حکومت، سلطنت، ملک	مہاجن	سود کا کاروبار کرنے والے، مراد ہندو
مجتہد العصر	زمانے میں مانا ہوا اجتہاد کرنے والا	حکیم الملک	ملک میں مانا ہوا حکیم یا دانا
قطب الملک	ملک میں مانا ہوا نیک آدمی	یوسفِ ہند	ہندوستان میں سب سے خوب صورت آدمی

مکاتیبِ اقبالؒ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
مخدوم	جس کی خدمت کی جائے	نوازش نامہ	محبت نامہ، خط
علالت	بیماری، ناسازی	لسانی عصبیت	زبان کی طرفداری
دینی عصبیت	دین کی طرف داری	مستقر	ٹھکانا، مرکز، رہنے کی جگہ
رزم گاہ	میدانِ جنگ، عمل کی جگہ	پبلشنگ سنٹر	اشاعت کا مرکز
طباعت	چھپائی، پرنٹنگ	صحرائیوں	صحرا میں رہنے والے
ترددات	پریشانیاں	سبحان اللہ	اللہ کی ذات پاک ہے، تعریفی جملہ
معنی آفرینی	معنی نکالنا، مطلب پیدا کرنا	دم زدن	سانس لینے کی
دکھڑا	دکھ کی باتیں	متنفس	سانس لینے والا، مراد انسان
مناصب	عہدہ، مرتبہ، منصب کی جمع	متاع	اثاثہ، جمع پونجی، مال
خانوادے	خاندان	مجدّد	تجدید کرنے والا، پرانے کو نیا کرنے والا
احیاء	حیات، زندگی، دنیا	احرار	حُر کی جمع، آزاد لوگ
مفقود	ختم، غائب	اضطراری	بے چینی

حمد

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
معراج	عظمت، بلندی	وجدان	دریافت، ذکاوت
صانع	کاریگر، خالق	خلّاق	تخلیق کرنے والا
نکہت	خوش بو	ترنّم	غنا، الاپ، نغمگی
گلبانگ	بلبل کی آواز، چہکنا، شادی کا شور	آیات	آیت کی جمع، نشانیاں

نعت

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
مفصّل	تفصیل	مجمل	مختصر، خلاصہ
ابد	آخر، دنیا کے خاتمے کا وقت	طُرّہ دستار	پگڑی کا اوپری اور بلند حصہ
ازل	آغاز، جب دنیا وجود میں آئی	رُخِ انور	روشن چہرہ
راہِ عدم	دوسری دنیا کا راستہ	مشعل	بڑی شمع، بڑا چراغ دان
مدّاح	مدح/تعریف کرنے والا	مستانہ قصیدہ	سرشار کرنے والا قصیدہ

شہر آشوب

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
لیل ونہار	رات اور دن	موجدار	موجوں والا
خلق	لوگ، مخلوق	صراف/ جوہری	سونے کا کاروبار کرنیوالے
بنیے	آٹا دال بیچنے والے	سیٹھ	امیر، دولت مند

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
ساہوکار	مہاجن، روپے کا کاروبار کرنے والے	بھجائیو	بھیجو
شرمسار	شرمندہ	نجیب	شریف، بزرگ
نابودگی	نہ ہونا	فرسودگی	پرانا پن، یہاں مراد پریشانی
بہبودگی	فائدہ، نفع	آسودگی	آرام، چین، امن وامان
کوڑی	سب سے چھوٹا سکہ، پیسا	رہ گزر	راستہ
مہر	محبت		

شہزادے کا چھت پر سونا اور پری کے ہاتھوں اغوا ہونا

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
مہتاب	چاند	خلل	خرابی
قضارا	اتفاقاً، اچانک	سیمیں	چاندنی جیسا
رخسار	گال	منور	روشن

دُرِ مراد

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
شاہِ دین	دین کا بادشاہ مراد حضرت امام حسینؓ	فَرس	گھوڑا
خلدِ بریں	جنت	کردگار	اللہ تعالیٰ
اوجِ زمین	زمین کی اونچائی	راہوار	تیز رفتار گھوڑا
نیّرِ دیں	دین کا سورج	دُرِ مراد	مطلب کا موتی
طبقے	طبق کی جمع۔ زمین کا چھوٹا ٹکڑا	مشہدِ امام	حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا مقام
آبِ بقا	آبِ حیات	خیام	خیمے کی جمع
خوش نہاد	خوش اخلاق	کرم کارساز	اللہ تعالیٰ کا کرم
توشہ	سفر کے دوران مسافروں کا کھانا	ناخدا	ملاح، کشتی بان
زاد	راستے کا خرچ	شاہِ ارجمند	قدر و قیمت والا بادشاہ

تختِ فرس پر علی اکبرؓ کا خطاب

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
مہرِ مبین	روشن سورج	سُرعت	تیزی
لاہوت	فنا فی اللہ کا مقام	ناسوت	عالم اجسام، دنیا، ظاہر
اسکندرِ دوراں	زمانے کا بادشاہ	یاقوت	سرخ رنگ کا ایک قیمتی پتھر
کاوِوں	گھوڑے کے قدموں سے بننے والا دائرہ	آب	چمک، روشن

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
نیسان	بارش	خاصانِ خدا	اللہ کے خاص بندے
بندکشا/عقدہ کشا	گرہیں کھولنے والا، مشکلیں آسان کرنے والا	عمران	حضرت موسیٰ کے والد کا نام
آئینہ گر	آئینہ بنانے والا	پشہ	مچھر
ہما	ایک خیالی پرندہ، کہا جاتا ہے کہ جس کے سر کے اوپر سے ہما گزر جائے وہ بادشاہ بن جاتا ہے	ہاروت وماروت	وہ دو فرشتے جو بنی اسرائیل کی آزمائش کے لیے اللہ تعالیٰ نے بابل شہر میں بھیجے تھے۔

اُمید

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
نہ دل بجھا	مایوس نہ کر	تگاپو	دوڑ دھوپ
پئے	واسطے، کے لیے	کئی/کے	ایران کے بادشاہان کا لقب
کنعان	حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کا وطن	کلمبس/کولمبس (columbus)	ایک سیاح جس نے امریکہ دریافت کیا
دردِ پنہاں	چھپا ہوا درد	نظمِ جہاں	دنیا کا نظم وضبط
محرم	رازدان	جوتا	جوتنے والا، ہل چلانے والا
سمیں	روشنی	موجزن	موجیں مارتا ہوا

نصیحتِ اخلاقی

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
ظہور	ظاہر ہونا	ہونہار	ہونے والا، جس میں لیاقت اور قابلیت کے آثار پائے جائیں۔
پند	نصیحت	غیور	غیرت مند
عقیل	عقل مند		
معین	مددگار		

جلوۂ سحر

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
زادگانِ شب	رات کے پیدا کردہ	شرار	چنگاریاں، یہاں مراد ستارے
شرق	مشرق	فسوں گر	جادوگر
شہود	شاہد کی جمع، حاضر	نیاز	حاجت، آرزو
صنم کدہ	بت خانہ	سنکھ	ناقوس، بیل کی سینگ سے بنتا ہے
پجاری	پوجا کرنے والے	پریت	محبت
جوئبار	بڑی نہر، جس میں دوسری نہریں آکر ملتی ہیں	رباب	ایک آلۂ موسیقی

پرانا کوٹ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
جاڑوں	سردیوں کا موسم	باوا آدم	حضرت آدم علیہ السلام یعنی کوٹوں کا باپ
نیلام	بولی بول کر بیچنے کا عمل	دہانِ زخم	منہ کے زخم
صلائے عام	عام دعوت	چینی انکھڑیوں	چینیوں کی چھوٹی آنکھیں
یارانِ نکتہ داں	عقل مند دوست	خراج	داد، تحسین
آزمودہ کار	آزمایا ہوا، تجربہ کار	ورق	صفحہ
واسکوڈی گاما	ایک پرتگالی جہاز راں	عبرت	سبق، نصیحت
جے بولنا	زندہ باد کہنا		

یہ سڑکیں

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
زائدالمیعاد	جس کا مقررہ وقت ختم ہو چکا ہو	گرداب	بھنور
مادر پدر آزاد	جن کا کوئی پرسانِ حال نہ ہو	بپھر کر	بے قابو ہو کر
صید	شکار	رستم وسہراب	ایران کے دو مشہور پہلوان
دمِ باراں	بارش کا وقت	زہرہ آب	خوف زدہ
خار	کانٹے	ہرچہ باداباد	جو ہوگا سو ہوگا
		بہزادیاں	ایرانی مصور کمال الدین بہزاد کے فن پارے
		چغتائیاں	لاہور کے مصور عبدالرحمٰن چغتائی کے فن پارے

قطعات

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
پناہ گزین	پناہ لینے والے، مہاجرین	شانِ بیداری	مستعد ہونے کی علامت
پردہ نشین	خواتین	غلاظت	گندگی
بھنگی	سویپر۔ جھاڑو دینے والا	محتسب	احتساب کرنے والا
جاروب کش	جھاڑو دینے والا	کمیٹی	میونسپل کمیٹی

اخلاص

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
ہم دوش	کندھے سے کندھا ملا ہو برابر	ثریا	ایک بلند ستارہ
اخلاص	خلوص، مہر، مروت، ہمدردی	یک جنبش گام	ایک قدم کی حرکت
دوام	دائمی، ہمیشہ	صیاد	شکاری

غزلیاتِ میر تقی میر

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
صدا	آواز	غم گُشاں	غمگین، مغموم، غم اُٹھانے والا
دل اُٹھانا	منہ موڑنا، دلچسپی نہ لینا	آبِ گرم	گرم پانی، یہاں آنسو مراد ہے۔
بے خود	غافل	جسمِ خاک	مٹی سے بنا بدن
جبیں	پیشانی	آلودہ	لتھڑا ہوا، گندہ
پرستش	عبادت، پوجا	ڈھونا	اٹھا کر لے جانا
پیری	بڑھاپا	آبِ حیات	ہمیشہ کی زندگی دینے والا پانی

خواجہ میر درد

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
صریحاً	واضح، صاف	مذکور	ذکر ہونا
مقدور	طاقت، قدرت	تئیں	تک
ناسور	پُرانا اور لاعلاج زخم	محتسب	احتساب کرنے والا، قاضی

شیخ غلام ہمدانی مصحفی

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
ناگہ	اچانک	کف	ہتھیلی، جھاگ
گل اندام	پھول جسم والا، محبوب	لبِ بام	کوٹھے یا چھت کا کنارہ
شکست رنگ	رنگ اُڑ جانا	اسیر	قیدی
پُرخمار	نشیلی	قطع	ترکِ ملاقات، کاٹنا، چھوڑنا

مرزا غالب

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
دائم	ہمیشہ، مستقل	حرفِ مکرر	غلطی سے دوبارہ لکھا ہوا لفظ
لعل و زمرّد	قیمتی اور خوش نما پتھر	بھرم کھلنا	راز کھلنا، اعتبار اُٹھنا
قدم بوسی	قدم چومنا، انتہائی احترام کا اظہار کرنا	طرّۂ پُرپیچ و خم	خم دار بڑی پگڑی جو امارت کی نشانی سمجھی جاتی ہے
خستگی	زخمی ہونا، شکستہ حالی	تیغِ ستم	ظلموں کی تلوار

مرزا داغ دہلوی

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
کوئی دم	کچھ دیر کے لیے	کم نگاہی	کم نظری، کم فہمی

مؤلفین کا تعارف

۱) ڈاکٹر اظہار اللہ اظہار (پی ایچ ڈی اُردو):

۱۹۹۱ء میں پشاور یونیورسٹی سے ایم۔اے اُردو اور بعد ازاں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور کے شعبۂ اُردو میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ٹیکسٹ بک بورڈ پشاور کی اُردو لازمی برائے جماعت نہم اور دہم کے مؤلف بھی رہے ہیں۔

۲) پروفیسر خالد صغیر زار:

۱۹۷۱ء میں جامعہ پشاور سے ایم۔اے اُردو درجہ اوّل میں پاس کیا۔ ۱۹۷۳ء سے محکمہ ہائیر ایجوکیشن کے تحت صوبے کے مختلف کالجوں میں درس و تدریس میں مصروف رہے۔ ٹیکسٹ بک بورڈ پشاور میں بھی اپنی خدمات بطور مؤلف انجام دیتے رہے۔ آپ اُردو اختیاری گیارھویں اور بارھویں جماعت کی کتاب کے بھی مؤلف ہیں۔ آج کل گورنمنٹ سپیریئر سائنس کالج پشاور میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

۳) پروفیسر محمد جمال:

۱۹۸۹ء میں پشاور یونیورسٹی سے ایم۔اے اُردو میں نمایاں پوزیشن حاصل کی۔ ۱۹۹۰ء سے ایڈورڈز کالج پشاور میں درس و تدریس سے منسلک ہیں۔ ۲۰۰۰ء سے صدر شعبۂ اُردو (ایڈورڈز کالج) کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

۴) ڈاکٹر جاوید بادشاہ (پی ایچ۔ڈی اُردو):

پشاور یونیورسٹی سے ۱۹۷۸ء میں ایم۔اے اُردو کیا اور اسی سال اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور میں درس و تدریس سے منسلک ہوگئے۔ پاکستان میں اور بیرون ملک اُردو کے حوالے سے منعقد ہونے والی کئی کانفرنسوں میں شریک ہو چکے ہیں۔

۵) ڈاکٹر طارق ہاشمی (پی ایچ ڈی اُردو):

آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے اُردو میں ایم۔اے اور پشاور یونیورسٹی سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ایڈورڈز کالج پشاور میں درس و تدریس سے منسلک رہے۔ آج کل فیصل آباد یونیورسٹی میں پڑھا رہے ہیں۔ ٹیکسٹ بک بورڈ پشاور کی اُردو اختیاری جماعت گیارھویں اور بارھویں کتاب کے مؤلف بھی ہیں۔

مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔
پس اپنے دو بھائیوں میں صلح کرادیا کرو
اور اللہ سے ڈرتے رہو
تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

(سورۃ الحجرات:۱۰)

جو حرام کھاتا ہے اس کی دُعائیں
قبول نہیں ہوتیں۔

(حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم)